مطالعات خطوطِ غالب

انتخاب: حکیم عبدالحمیدؒ

مطالعات خطوط غالب

انتخاب

حکیم عبدالحمیدؒ

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

نام کتاب : مطالعات خطوط غالب
انتخاب : حکیم عبدالحمیدؒ
سن اشاعت : 2009ء
قیمت : -/150روپے
تعداد اشاعت : 500
ناشر : غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۔ 110013
کمپوزنگ : افراح کمپیوٹر سنٹر، D-15، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025
طابع : نیو پرنٹ سنٹر، دہلی
پیشکش : ڈاکٹر عقیل احمد

ISBN—81-904001-7-7

فہرست

●●●

پیش لفظ

غالب اکیڈمی کے قیام کا منصوبہ حکیم عبدالحمیدؒ نے 1935ء میں بنایا تھا۔اسی سال اکیڈمی کی عمارات کے لیے ایک قطعۂ اراضی مزار غالب سے ملحق خریدی گئی۔ 1935ء سے ہی حکیم صاحب نے غالب پر مضامین یکجا کرنے کا کام شروع کردیا تھا۔ غالب صدی کے دوران 22رفروری 1969ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے غالب اکیڈمی کی عمارت کا افتتاح کیا۔اسی موقع پر یوسف حسین خاں مرحوم کی کتاب ''غالب اورآہنگ غالب''، ہندی میں سرل غالب، انگریزی میں نوائے سروش کے عنوان سے غالب اکیڈمی نے تین کتابیں شائع کیں۔اوراب تک دودرجن کتابیں غالب اکیڈمی شائع کرچکی ہے۔حکیم صاحب نے اپنے ذاتی ذخیرے سے غالب اکیڈمی کی عمارت میں ایک میوزیم اور ایک لائبریری بھی قائم کی۔1935ء سے ہی حکیم صاحب کو غالب پر لکھی گئی جوتحریریں ملیں، انھیں مطالعے کے بعد مختلف عنوان کے تحت فائل میں محفوظ کرتے گئے۔ انھیں فائلوں کے مضامین سے 1999ء میں ایک کتاب ''حالات غالب'' کے نام سے ترتیب دی گئی تھی جسے انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز، نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔ 2008-09 میں حکیم صاحب کی پیدائش کی صدسالہ تقریبات کا اہتمام کیا جارہاہے۔اس موقع پر حکیم صاحب کے جمع کردہ مضامین، جوغالب کی نثریعنی غالب کے خطوط سے تعلق رکھتے ہیں، کل گیارہ مضامین پرمشتمل کتاب ''مطالعات خطوط غالب'' پیش خدمت ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون مولوی مہیش پرشاد کا ہے جو غالب کے پہلے مجموعے ''عود ہندی'' کی ترتیب سے تعلق رکھتاہے، جس میں عود ہندی کے مختلف ایڈیشنوں میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرا مضمون ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ''غالب کے خطوں کے لفافے'' ہے۔غالب جس قدر دلچسپی خط لکھنے میں لیتے تھے، ویسی ہی دلچسپی وہ لفافوں کے چھپوانے اوراس پر پتے لکھنے میں لیتے تھے، جس کی دلچسپ تفصیل اس مضمون میں ملے گی۔

تیسرا مضمون برجموہن دتاتریہ کیفی کا ''غالب اوراردو خطوط نویسی'' ہے۔اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب سے پہلے، اسی زمانے میں ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالے

''محبِ ہند'' میں خطوط نویسی کی جس طرز پر زور دیا، وہی طرز غالب نے بھی اپنائی۔

قاضی عبدالودود کا مضمون ''غالب کے خطوط ــ صفیر بلگرامی کے نام ہے'' غالب کے محققین میں قاضی عبدالودود کا نام بہت اہم ہے۔ صفیر بلگرامی صاحب عالم مارہروی کے نواسے اور غالب کے دوست تھے۔ صفیر کے خطوط اور غالب کے خطوط اور صفیر سے غالب کے تعلقات کے سلسلے میں یہ مضمون بہت اہمیت کا حامل ہے۔

پانچواں مضمون مختارالدین احمد کا ''غالب کے ایسے تین غیر مطبوعہ خطوط'' پر مشتمل ہے، جو غالب کے خطوط کے مجموعوں میں نہیں ملتے۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کے ''1883 کے دو خط متعلق بہ غالب'' نامی مضمون میں دو ایسے خط پیش کیے گئے ہیں جو غالب کے انتقال کے چودہ سال بعد لکھے تو صفیر بلگرامی کو گئے ہیں لیکن خاص غالب سے تعلق رکھتے ہیں۔

سید قدرت نقوی کے مضمون ''غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب'' میں عود ہندی اور اردوے معلّیٰ میں شامل خطوط کی تاریخوں اور تدوین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آٹھواں مضمون نادم سیتاپوری کا ''غالب کے دو اور خط'' ہے۔ جس کے حوالے سے نادم سیتاپوری نے غالب کے عزیزوں سے ان کے مراسم پر روشنی ڈالی ہے۔

نواں مضمون قاضی عبدالودود کا ''لطائفِ غیبی'' ہے۔ لطائف غیبی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غالب نے اسے سیاح کے نام سے خود لکھ کر چھپوایا تھا جس کا تعلق قاطع برہان سے ہے۔

دسواں مضمون مالک رام کا ''غالب کے ادبی معرکے'' ہے، جس میں غالب سے اپنے معاصرین سے جاری چپقلش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کے سارے مضامین براہ راست یا بالواسطہ طور پر خطوط غالب کے مطالعے کے لیے معاون ہیں اور مضامین نگار حضرات کی تحریریں تبرکات کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن رسائل نے ان تحریروں کو شائع کیا ان کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے کہ ان سب نے خطوط غالب کے مطالعے میں اہم رول ادا کیا۔ یہ مضامین ممکن ہے کہ الگ الگ جگہوں پر پڑھنے کو مل جائیں لیکن ان کو مجتمع کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اس سے یہ کتاب طلباء، اساتذہ اور غالب پر کام کرنے والوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔

عقیل احمد

منشی مہیش پرشاد مولوی فاضل
بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

''عود ہندی'' کی ترتیب

مرزا غالب دہلوی کے رقعات وخطوط کے دو اہم مجموعے ہیں ایک ''عود ہندی''، دوسرا اردوے معلیٰ۔ عود ہندی کی ضخامت اگر چہ اردوے معلیٰ سے کم ہے لیکن یہ مجموعہ اردوے معلیٰ سے پہلے شائع ہوا ہے اس لیے پہلے اِسی کے بارے میں کچھ لکھنا مناسب ہے۔

عود ہندی دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں مرزا کے لکھے ہوئے 31 خط ہیں اور اسی میں ایک دیباچہ چودھری عبد الغفور سرور صاحب کا لکھا ہوا ہے، جو قصبہ مارہرہ (ضلع ایٹہ) کے ایک رئیس اور مرزا کے ایک عزیز شاگرد تھے۔ چودھری صاحب اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''جب کلام بلاغت نظام رشک صائب فخر طالب جناب اسد اللہ خاں صاحب غالب کا دیکھا، دل کو بھایا، یکتا پایا۔ ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا۔ سبحان اللہ۔ وہ زبان کہاں پاؤں کہ اُن کے خلق کا بیان لب پر لاؤں۔ مجھ سے ناچیز حقیر پر وہ ذرہ نوازی مہر وار فرمائی کہ میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاح شعر وعبارت میں دریغ اور ننگ نہ فرمایا، جو نامہ کہ بنام میرے بہ عبارت اردو تحریر کیا مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر اور ہر سطر اُس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے جس آنکھ نے دیکھا وہ بینا ہے، جس کان نے سنا وہ شنوا ہے۔ پس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اُٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل

مائل تمام بشہرت عام ہوا اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا کہ بحسن اتفاق فخر زمان وحید دوران جناب ممتاز علی خاں صاحب متوطن میرٹھ کہ ریعان شباب میں بہ تہذیب نفس شب بیدار، تہجد گزار، دل نرم، ہنگامۂ محبت گرم اخلاق، مجسم شفیق، مکرم فطرت ارجمند، ہمت بلند، خصائل حمیدہ، اوصاف پسندیدہ، پاک نہاد، متحد باتحاد پاکیزہ، روشن اخلاق منش، سخن شناس، انصاف اساس خوش تقریر عدیم النظیر ہیں۔ رونق افزائے مارہرہ ہوئے اور قدوم تقدس لزوم سے اِس قصبہ کو مشرف کیا اور ایک روز محفل ممدوح میں ذکر ہمہ دانی و شیوا بیانی جناب استاذی و مخدومی درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام مرزا صاحب نسیم جانفزا اور شمیم دلکشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا اردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر فارسی تو محلی بحلیۂ انطباع ہوا لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمھارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو تو میں اُس کے انطباع کا بیڑہ اُٹھاتا ہوں۔ اِس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا، منشاء خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے، ترتیب دیے۔ گویا جواہر بے بہا کان قلمدان سے نکل کر، کشتی اوراق میں جمع کیے۔ چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ہے لہٰذا نام اس انشاء کا مہر غالب بکسر میم مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اِس نام سے مطابق پایا۔ طبیعت اور بڑھی۔ تحریر تاریخ کو دست و قلم بڑھایا۔

انشا مملو بصد مطالب لکھی ۔۔۔ یعنی پئے دوستان طالب لکھی

موسوم کیا جو مہر غالب سے سرور ۔۔۔ تاریخ بھی اُس کی مہر غالب لکھی

کوکب شعر شاعران ہند پرتو التفات غالب سے روشن اور خاک فکر ہندیان آبیاری مکرمت ممدوح سے گلشن ہو جیو۔ آمین ثم آمین۔"

مگر فصل اول سے ظاہر ہے کہ اِس میں صرف مرتب ہی کے نام کے خطوط شامل و داخل نہیں ہیں بلکہ چند وہ خطوط بھی ہیں جو کہ حضرت صاحب عالم و شاہ عالم کے نام ہیں۔ وجہ یہ کہ تینوں حضرات کے باہمی تعلقات بہت زیادہ تھے۔ مثلاً مرتب کے نام کے ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں:

''اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے تفقد نامہ نامی میں صورت عز و شرف نظر آئی۔ اللہ اللہ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ہے آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ الخ۔'' (خط 28)[1]

ایک اور خط چودھری صاحب کے نام یوں ہے:

''ایک عبارت لکھتا ہوں چوں کہ لفافہ جناب چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا ہوگا پہلے وہ پڑھیں پھر میرے پیر و مرشد کی نظر سے گزاریں۔ پیر و مرشد زادہ شاہ عالم صاحب کو دکھائیں۔ برس دن سے فساد خون کے عوارض میں مبتلا ہوں ثبور و اورام میں لدر ہا ہوں۔ الخ۔'' (خط۔3)

دوسری فصل میں 137 خط 2 تقریظیں اور تین دیباچے مرزا کے لکھے ہوئے ہیں۔ میرٹھ کے رئیس اور مرزا کے دوست حاجی محمد ممتاز علی خاں نے عود ہندی کا جو دیباچہ لکھا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ مرزا کے خطوط کی تدوین کی نوبت کیونکر آئی تھی اور چودھری عبدالغفور ''سرور'' اور اُس وقت کے لفٹنٹ گورنر کے میر منشی خواجہ غلام غوث ''بے خبر'' کو اُنھوں نے اپنا شریک کار بنایا تھا، چنانچہ حاجی صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو اُن کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں، لوگوں نے فیض اُٹھائے، تعویذ بازو بنائے، مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی، یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی حالانکہ نثر اردو اُن کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سلاست بیان، شستگی زبان، روزمرہ کی صفائی اور اُن کی شوخی کسی کو کب میسر ہے، اُسے بھی

---

1. یہ مطابق شمار نسخہ مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد درج کیا گیا ہے اور آئندہ بھی اس مضمون میں اسی نسخے کے عدد لکھے گئے ہیں لیکن جو اقتباسات نسخہ مطبوعہ رفاہ عام پریس آگرہ کے ہیں اُن میں نسخے کا نمبر دیا گیا ہے لیکن اور اڈیشنوں میں شمار غلط درج ہیں لہٰذا ایسے نسخوں میں بعض خط کچھ آگے پیچھے ملیں گے۔

(مضمون نگار)

ترتیب دیجیے۔ قدردانوں پر احسان کیجیے۔ میرے عنایت فرما اور مرزا صاحب کے شاگردِ یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو اُنھوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے اُن کے نام آئے تھے سب کو ایک جا کرکے اور اُس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصہ تک سرگرم تلاش رہا جا بجا سے تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اُٹھائی تب تمنا بر آئی اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب بہادر بے خبر تخلص جو نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی وشمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص با اختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ اُن کی بدولت بہم پہنچا۔ اِس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور اُن کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خاتمہ میں چند نثریں ہیں جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔ عودِ ہندی اِس کتاب کا نام ہے، خوشبو اِس کی تمام عالم میں پھیلے۔ اِسی دعا پر ختم کلام ہے۔''

'فغانِ بے خبر' میں خواجہ غلام غوث بے خبر کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے بعض حضرات کے نام لکھے ہیں۔ اُن میں سے بعض خطوں سے جو مرزا غالب یا بعض اور مکتوب الیہم کے نام ہیں یہ ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب نے عودِ ہندی کی ترتیب وتدوین میں مولوی ممتاز علی صاحب کا بہت کچھ ہاتھ بٹایا تھا چنانچہ خواجہ صاحب ایک خط[1] میں مرزا غالب کو لکھتے ہیں:

''حضرت، نسخہ عودِ ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور اُن کا دیباچہ آ گیا۔ میں نے سوائے اِس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا کالپی اور

---

1. فغانِ بے خبر، صفحہ 82، 83۔

لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں۔ خود سب کو دیکھا۔ جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے اُن کو نکال ڈالا۔ کاتب لکھ رہا ہے میں مقابلہ کرتا ہوں۔ اب تک بڑے ورقوں کے دس جز و مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ اُدھر اگست کا آغاز ہو اِدھر اِس مجموعہ کا انجام ہو، میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لیے اُن کے حوالہ کروں۔ اِس وقت بھی مقابلہ میں مصروف ہوں۔ پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خان صاحب ''شیفتہ''، منشی حبیب اللہ صاحب ''ذکا''۔ میاں داد خاں صاحب ''سیاح'' اِن حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے۔ آپ انھیں ایسا کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے شاید وہاں سے بھی کچھ آجائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آئیں اور اُس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔''

اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں[1]:

''قبلہ آپ بیشک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک امر جدید مقتضی اِس کا ہوا کہ آپ کو اُس کی اطلاع دوں۔ خانۂ کاہلی خراب آج لکھوں کل لکھوں۔ اب کون لکھے کل صبح کو لکھوں گا صبح ہوئی غالب اِس وقت نہ لکھ، سہ پہر کو لکھیو۔ آج دوشنبہ 23/ جولائی بارہ پر دو بجے ہرکارہ نے آپ کا خط دیا پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اُسی طرح جواب لکھا۔ اگر چہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا مگر بھجوا دیا، کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ''ذکا'' اور نواب مصطفیٰ خاں ''حسرتی'' کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ''ذکا'' کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاء اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے۔ کہار آیا خط لایا۔ آم پہنچے کچھ بانٹے

---

1 عود ہندی، خط۔ 161، سنہ 1866ء۔

کچھ کھائیے۔ بچوں کو دعا بچوں کی بندگی مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام۔

.... جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب وشمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا اس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم ونثر اردو طلب کی تھی مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے بعد انطباع وحصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔ زیادہ حد ادب نامہ جواب طلب۔''

پھر اس کے جواب میں خواجہ صاحب نے مرزا کو لکھا ہے[1]:

''منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے کل لکھا کہ آپ ایک عرضی جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس کے حضور میں بھیج دیں اور اُس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعہ نثر کا ذکر لکھا ہے اُسے میں مرتب کرتا ہوں عنقریب چھپنا شروع ہوگا۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لیے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے۔ اس سے بہتر اور کوئی طریقہ صاحب تک ذکر پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا۔ جا بجا سے جو آپ کے خطوط جمع کیے گئے وہ اصل تو کہیں سے آئے نہیں، نقلیں آئیں۔ سرور کے نام کے ایک خط میں جلال اسیر کا ایک مصرعہ لکھا ہے، وہ اِسی قدر پڑھا جاتا ہے۔

زفیر در شکر آب است۔

بعد اِس کے کیا جانے کیا لفظ لکھا ہے۔ مارہرہ والوں کے خط کا حال تو آپ پر خوب ہویدا ہے۔ دوسرے لفظ پنشن کو کہیں مذکر لکھا ہے اور کہیں مؤنث۔ آپ تو اُسے مخنث کیوں بناتے۔ مگر یہ خرابی بھی کاتب سے ہوئی ہے۔ ان دونوں کی تصحیح لکھیے تو کتاب میں صحیح لکھ دیا جائے۔''

ایک اور خط میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں[2]:

''یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا محمد خان صاحب سے اپنی اردو نثریں

1۔ فغان بے خبر، ص 81، 82۔ 2۔ فغان بے خبر، ص 100۔

لے کر مجھے بھیج دیجیے۔ اس کا کچھ جواب ہی ارشاد نہ ہوا۔''

اِس میں شک نہیں کہ عود ہندی کی ترتیب میں مولانا بے خبر کی کارفرمائی کو بہت کچھ دخل تھا۔ وقتاً فوقتاً مرزا کی بھی مدد شامل حال تھی چنانچہ مرزا غالب نواب انورالدولہ ''شفق'' کو ایک خط[1] میں لکھتے ہیں:

''اگر ان سطور کی نقل میرے مخدوم مولوی غلام غوث خاں بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجیے تو اُن کو خوش اور مجھ کو ممنون کیجیے گا۔''

ہاں عود ہندی کے معاملے میں مرزا صاحب کی عجلت پسندی بھی قابل ذکر ہے کیوں کہ عود ہندی کا نسخہ جبکہ زیر ترتیب ہے، چھپنے میں دیر ہے اور آپ نے نسخوں کے لیے تقاضے شروع کر دیے ہیں مثلاً ایک خط[2] مؤرخہ 7/مارچ سنہ 1864ء میں خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں:

''ہاں حضرت! کہیے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی۔ وہ مجموعہ اردو چھپا یا چھپا ہی رہے گا۔ احباب اُس کے طالب ہیں بلکہ بعض نے طلب کو بسر حد تقاضا پہنچا دیا ہے۔''

ایک اور خط[3] میں لکھتے ہیں:

''اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں اُن کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اُن سے کہیں، مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اُن سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اِس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔ مصرعہ۔ تم سلامت رہو قیامت تک[4]''۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ عود ہندی

---

1. عود ہندی، 104۔ 2. عود ہندی، خط 111۔

3. عود ہندی، خط 124 (جو غالباً جون سنہ 1865ء میں لکھا گیا تھا۔)

4. یہ خطوط اُردوے معلیٰ میں شامل کیے جانے کے لیے طلب کیے گئے ہیں۔

کا دیباچہ مرزا صاحب خود لکھیں۔ چنانچہ ایک بار اس ضمن میں مرزا نے یہ لکھا[1]:

''بندہ پرور اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرماں بردار رہا ہو بڑھاپے میں ایک حکم بجانہ لاوے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعہ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اس مجموعے کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔ بیت:

رسم ایست کہ مالکان تحریر

آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اُسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ الخ۔''

ایک اور خط مرزا نے یوں لکھا ہے:

''حضرت پیر و مرشد اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحب فراش ہوں۔ اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں، اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا۔ اشعار ان کے آئے اصلاح دے دی۔ منشاء اصلاح جابجا حاشیے پر لکھ دیا۔ کل جو عنایت نامہ آیا اس میں بھی دیباچے کا اشارہ اور تفتہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا۔ ناچار تحریر سابق تا اعادہ کر کے حکم بجالایا[2] الخ۔''

چودھری عبدالغفور ''سرور'' صاحب نے جو دیباچہ پہلی فصل کا لکھا ہے، اس پر مرزا نے اپنی خوشنودی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے[3]:

''اہاہا! جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب مارہرہ پہنچے۔ صاحب یہ تو سیاح گیتی نورد ثانی مخدوم جہانیاں جہاں گرد ہیں۔ بہر حال آپ نے دیباچہ بہت

1۔ عود ہندی، خط 115۔ 2۔ عود ہندی، خط 127۔

3۔ مکتوب بنام چودھری عبدالغفور ''سرور'' عود ہندی، ص 31۔

اچھا لکھا ہے۔ کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی'' الخ۔

آخر کار خدا خدا کر کے عود ہندی کی ترتیب ختم ہوتی ہے اور وہ منشی ممتاز علی صاحب کی خدمت میں بھیجی جاتی ہے۔ چنانچہ مرزا کو خواجہ صاحب ایک خط میں یوں لکھتے ہیں[1]۔

''جناب عالی میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے۔ اس میں یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے۔ آج تک جواب نہ آیا۔ کیونکر مجھے حیرت نہ ہو، جب ترک جواب حضرت کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجیے۔ مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجیے۔ الحمد للہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بندھوا کر آج ہی منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی۔ اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی انھیں اختیار ہے۔''

خواجہ صاحب کے اس خط میں مولوی صاحب جہانگیر نگری کے رسالے سے مراد ''موید برہان'' ہے جو مرزا کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں سنہ 1282ھ یعنی سنہ 1866ء میں شائع ہوئی ہے۔ پس اِس اور نیز مذکورہ بالا تحریر کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''عود'' کا نسخہ اگست یا بعد اگست سنہ 1866ء (میں) منشی ممتاز علی صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، مگر ہاں یہ بھی واضح رہے کہ خواجہ صاحب کا ایک خط جو منشی ممتاز علی صاحب کے نام ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ نے ''عود ہندی'' کے نسخے کو سیدھے منشی صاحب کے پاس نہیں بھیجا تھا، علاوہ بریں اِسی خط کی بدولت ''عود ہندی'' کے متعلق کچھ اور باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جیسا کہ خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں[2]:

''مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کر کے آج مصنف صاحب کے حوالے کیا کہ غازی الدین حسین خاں صاحب کے پاس بھیج دیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ مصنف آپ سے بہت قریب ہیں۔ ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجیے تب چھپوانا شروع کیجیے تو بہتر ہے۔ فقیر نے اس کے ترتیب

---

1. فغان بے خبر، ص 83 و 84۔ 2. فغان بے خبر، ص 85۔

دینے اور لکھوانے اور بذاتِ خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے آپ نے کھودیے اُن کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے گورکھپور، لکھنؤ، کانپور سے کچھ بہم پہنچایا اور تین نثریں مصنف سے اور لیں اور اُن سب کو بھی مجموعہ میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے اُس کی تصحیح کرلی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاق نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے لیے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوالے گا اور جو جو نقل کے طالب ہوں گے اُن کو دے دے گا۔''

القصہ عود ہندی کا نسخہ منشی صاحب کے پاس پہنچا۔ بہت کچھ چھپ کر کافی عرصہ تک کھٹائی میں پڑا رہا کیونکہ خواجہ صاحب ایک خط میں مرزا صاحب کو لکھتے ہیں[1]:

''اس سال روہیلکھنڈ کا دورہ ہونا ہے۔ کل تک لشکر رام پور کے علاقہ میں تھا۔ آج بریلی کی حد میں داخل ہوا۔ زندگی باقی ہے تو پانچویں فروری کو یہ دورہ ختم ہوگا اور الہ آباد پہنچیں گے۔ میں جب الہ آباد سے مراد آباد لشکر میں شامل ہونے کو آیا تھا، میرٹھ ہوکر آیا۔ وہاں منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے دکھائی۔ سب چھپ گئی۔ ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خاں صاحب نے قطعہ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے پھینک رکھا ہے۔ مراد آباد میں اخبار ''جلوۂ طور'' کا مہتمم بھی وارد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی ناتمام پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔ میں نے خاں صاحب کو لکھا تو ہے کہ قطعہ تاریخ کا ہونا فرض نہیں۔ یوں ہی اُس صفحہ کو چھپوا کے کتاب تمام کر دیجیے۔ دیکھیے خدا کرے کہ وہ مان لیں۔''

چودھری عبدالغفور ''سرور'' کے لکھے ہوئے دیباچے کا جو اقتباس پہلے مذکور ہے اس سے ثابت ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے مرتب کیے ہوئے مجموعے کا تاریخی نام ''مہر غالب'' رکھا

1۔ فغانِ بے خبر، ص 129۔

ہے۔ چنانچہ اسی کو یعنی سنہ 1278ھ (سنہ 1861ء یا 1862ء) کو بعض حضرات نے تمام عود ہندی کا سال ترتیب یا سال اشاعت سمجھا ہے، مگر حقیقت میں ''عود ہندی'' کی اشاعت سنہ 1868ء میں مرزا کی وفات سے کل چار مہینے پہلے ہوئی ہے۔ کیوں کہ اس کے اخیر میں تاریخ اشاعت 2/رجب سنہ 1285ھ 15/اکتوبر سنہ 1868ء درج ہے۔ باقی اس کی تعریف کے بارے میں پہلے بتایا جاچکا ہے کہ تمام مسودہ سنہ 1866ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ کر مالک مطبع کے حوالے کیا۔

چونکہ عود ہندی کی پہلی اشاعت کا میسر آنا اب آسان کام نہیں لہٰذا اس کے متعلق چند ضروری باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

1۔ تقطیع بڑی ساڑھے نو × چھ انچ۔

2۔ کاغذ سفید، لکھائی چھپائی معمولی۔

3۔ حجم 188 صفحے۔

4۔ کتابت میں یاے معروف اور یاے مجہول کا لحاظ نہیں۔

5۔ چھاپے کی غلطیاں بہت ہیں باوجودیکہ مولانا ''بے خبر'' نے صحت کا بہت اہتمام کیا تھا۔

خواجہ صاحب نے مولوی عبدالقیوم صاحب صدر امین علی گڑھ کو اپنے ایک خط میں عود ہندی کے اس مطبوع نسخے کی بابت یہ لکھا ہے:

> ''عود ہندی یعنی مرزا غالب کے رقعات کا مجموعہ مجھ تک پہنچا۔ افسوس ہے کہ نہایت غلط چھپا۔ بہت جگہ غلطی سے مطلب خبط ہے۔''

جب عود ہندی چھپ چکی تھی اور اردوے معلیٰ چھپ رہی تھی تو مرزا غالب نے ایک خط خواجہ صاحب کو لکھا تھا جس میں انھوں نے ''عود ہندی'' کے نسخے کو مہمل قرار دے کر دوسرے مجموعے کی ضرورت بتلائی تھی۔ چنانچہ اس خط کے جواب میں خواجہ صاحب عود ہندی کی نسبت لکھتے ہیں:

''پہلا مجموعہ اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا بہت مناسب ہوا۔'' خلاصہ یہ کہ باوجود تمام کوششوں کے ''عود ہندی'' مرزا غالب اور خواجہ ''بے خبر'' دونوں کے نزدیک تسلی بخش اور صحیح نہ چھپی۔

پہلے اڈیشن کے بعد مختلف مطابع سے عود ہندی کے جو اڈیشن شائع ہوئے ہیں ان میں سے یہ اڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں:

1۔ مطبع نارائنی دہلی۔ 23رفروری سنہ 1878ء (20رصفر سنہ 1295ھ)۔

2۔ مطبع نول کشور کانپور۔ ستمبر 1878ء (رمضان 1295ھ)۔

3۔ مطبع مفید عام آگرہ۔ مئی سنہ 1910ء

4۔ مطبع نول کشور واقع کانپور سنہ 1913ء (بار چہارم)۔

5۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سنہ 1927ء۔

6۔ نیشنل پریس الہ آباد سنہ 1929ء۔

7۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد۔

8۔ مطبع کریمی لاہور۔

9۔ گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور۔

عود ہندی مکمل یا اس کا کم و بیش حصہ مختلف امتحانات کے نصاب میں داخل ہے اور میرا خیال ہے کہ پہلے اڈیشن کے بعد 'عود' کے کل تقریباً 12 ہزار نسخے مختلف مطابع سے شائع ہو چکے ہیں، اور پہلے اڈیشن اور دیگر اڈیشنوں میں جو باتیں نمایاں طور پر ملتی ہیں وہ یہ ہیں:

1۔ پہلے اڈیشن کے ہر رقعے کے عنوان میں شمار کا عدد درج نہیں لیکن بعد کے اڈیشنوں میں درج ہے۔

2۔ آخر زمانے کے بعض اڈیشنوں کے سرورق پر کتاب کا نام اس طرح درج ہے[1]:

"عود ہندی
مسمی باسم تاریخی
مہر غالب"

لیکن پہلے اڈیشن کے سرورق پر اس قسم کی عبارت نہیں۔

1۔ (1) نسخہ مطبوعہ انوار احمدی پریس الہ آباد۔ (2) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (3) گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور

3۔ ذیل کی عبارتیں عودِ ہندی کے عام نسخوں میں اُن خطوط کی عبارتوں کے ساتھ شامل ہیں جو چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہیں مگر پہلے اڈیشن میں حاشیوں پر مندرج ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پہلے اڈیشن میں مندرج ہیں، مرزا نے اپنے قلم سے اُن کو اُسی طرح لکھا تھا۔

(1) ''اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔''

خط نمبر 3

(2) ''اب خطاب جناب حضرت عالم کی طرف ہے۔''

خط نمبر 5

(3) ''یہاں سے روئے سخن صاحب عالم کی طرف ہے۔''

خط نمبر 6

(4) ''یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف ہے۔''

خط نمبر 18

(5) ''اب روئے سخن حضرت عالم کی طرف ہے۔''

خط نمبر 28

عودِ ہندی کی اشاعت کے باب میں جو کوششیں اب تک ہوئی ہیں وہ ہماری شکر گزاری کی مستحق ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر نہایت ہی افسوس ناک ہے کہ عودِ ہندی کے اغلاط و اسقام کی درستی کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ ذیل میں بطور نمونہ دو عبارتوں کا صحیح مسودہ اصل خطوط کے مطابق پیش کیا جاتا ہے، پھر ان کی وہ غلط صورتیں دی جاتی ہیں جو عودِ ہندی کے پہلے اڈیشن میں اور اُس کے تتبع میں دوسرے اڈیشنوں میں بھی پائی جاتی ہیں:

اصل عبارت	عودِ ہندی میں مطبوعہ
(1) پیر و مرشد فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر حاضر رہا ہے	پیر و مرشد فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے۔ (مکتوب بنام قاضی عبدالجمیل بریلوی)

(2) جناب قاضی صاحب کوسلام اور قصیدے کی بندگی۔ اگر مجھے قوۃ ناظمہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدے کی تعریف میں ایک قطع اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔ بات یہ ہے کہ جو میں شایستہ مدح نہیں تو یہ ستایش راجع آپ کی طرف ہوگی۔ گویا یہ قصیدہ آپ ہی کی مدح میں ہے۔ میں اب رنجور نہیں۔	جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدے کی بندگی۔ اگر مجھے قوۃ ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدے کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔ بات یہ ہے کہ جو آئین شایستہ مدح میں ہے۔ میں اب رنجور نہیں۔ (مکتوب نمبر 154 بنام قاضی عبدالجمیل بریلوی)

مطبع مفید عالم آگرہ (1910ء) کے نسخے میں بعض عبارتیں پہلے اڈیشن کی عبارتوں سے جس قدر مختلف ہوگئی ہیں، اس کا کسی قدر اندازہ ذیل کے نقشے سے ہوسکتا ہے:

پہلا اڈیشن	آگرہ والا نسخہ
(1) صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی۔ ہے ہے! اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خون نابہ ظہور میں آئی ہوگی۔	(1) صاحب یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی ہے۔ اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خون نابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ نمبر 9، ص 22۔
(2) وہ چیز حصے میں اگر پارسیوں کے آئی ہے ہاں اردو زبان میں اہل ہند میں وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمۃ	(2) وہ چیز حصے میں اگر پارسیوں کے آئی ہے ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ مرتضیٰ علیہ الرحمۃ۔ نمبر 29، ص 43۔
(3) خدا کرے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے آرام نہیں آتا۔	(3) خدا کرے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ حقانی آدمی کو بغیر حال معلوم ہوئے آرام نہیں آتا۔ نمبر 94، ص 104۔

خواجہ صاحب نے عود ہندی کا جو قلمی نسخہ منشی ممتاز علی صاحب کے پاس چھپنے کے لیے بھیجا تھا اس کے متعلق منشی صاحب کو لکھا تھا کہ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے۔ خواجہ صاحب کی اس تحریر کی بنا پر میں نے کوشش کی کہ خواجہ صاحب نے اپنا جو ذاتی کتب خانہ چھوڑا ہے اس میں کہیں وہ نسخہ مل جائے۔ مگر خواجہ صاحب کے جو اعزہ بنارس میں ہیں ان کی زبانی معلوم ہوا کہ اُن کا بے بہا سرمایہ بنارس ہی میں ضایع ہو کر مفقود ہو چکا ہے۔ تاہم ہنوز کوشاں ہوں۔ ممکن ہے کہ کہیں وہ نسخہ دستیاب ہو جائے تاکہ اغلاط کی تصحیح یقین کے ساتھ ہو سکے کیونکہ عود ہندی کے تمام اڈیشنوں میں غلطیاں بہت ہیں اور جیوں جیوں اس کے اڈیشن بڑھتے جا رہے ہیں تیوں تیوں غلطیوں میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آیندہ انہی غلطیوں کو کہیں صحت کا درجہ نصیب نہ ہو جائے اور بطور سند پیش کی جائیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ خواجہ صاحب کے پاس مرزا صاحب کے اصل خطوط کہیں سے نہیں آئے تھے بلکہ ان کی نقلیں آئی تھیں۔ پس اگر کہیں اصل خطوط کا پتہ لگے تو تصحیح اور بہتر طور پر ہو سکتی ہے؛ اکثر خطوط کی تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں اور بعض خطوط کے مضامین میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جناب قاضی محمد خلیل صاحب رئیس اعظم بریلی کے پاس مرزا کے جو اصل خطوط ہیں اور جن میں سے بیشتر عود ہندی میں شائع ہو چکے ہیں ان کی بدولت میں تصحیح بھی کر سکا ہوں اور بہت سے خطوط کی تاریخیں بھی معلوم کر سکا ہوں۔ اور کئی خطوط کے مضامین میں اضافہ کر سکا ہوں۔ چنانچہ ایک خط[1] مطبوعہ نسخوں میں صرف اس قدر ہے:

"جناب عالی وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں، یعنی عدم۔ مدعا یہ کہ گم ہو گئی۔"

مگر اصل مکتوب کی پوری عبارت یہ ہے:

"جناب عالی — وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں، یعنی عدم۔ مدعا یہ کہ گم ہو گئی۔"

گھات میں مدعا بر آری کی ہم نے غیروں کی غم گساری کی

1۔ عود ہندی، خط 156۔

تقدیم وتاخیر مصرعتین کر کے رہنے دو اس میں کوئی سقم نہیں۔ مدعا براری
کا یستھوں کا لفظ ہے۔ میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں مگر چونکہ
من حیث المعنی یہ لفظ صحیح ہے مضایقہ نہیں۔

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن وکاہ برآوردن یعنی لطف زیادہ
نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے بقدر یک مژہ برہم زدن ثبات وقرار ہے۔
حیرت ازالہ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر برابر
بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بصورت اُس تاگے کے بن گیا جس میں
موتی پروئے ہوں۔

لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چین سے۔ کرتا مربوط ہے آہ وفغاں سے، عربی
میں تعقید لفظی ومعنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے۔
بلکہ فصیح اور بلیغ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعتین یہ کہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم
چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ وفغاں کرتا۔

ملنا اگر نہیں ترا آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر اگر تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی۔ نہ
ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں۔ جس سے تو چاہتا
ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔ 12

حسن اور اُس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

مولوی صاحب کیا لطیف معنی ہیں داد دینا۔ حسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے گمان اس کا صحیح، کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور یہ گمان اُس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے، اور حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا، ہوسناک آدمی تھا۔ اگر پاے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے، ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضع دار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اُس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ وشیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط کیسا جواب۔ دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعے کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر۔ اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں۔ اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس میں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا۔ خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے[1]۔

خواجہ صاحب کا ایک خط پہلے درج کیا جا چکا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ جو مضمون

1۔ اس خط کے بیشتر مسودے کا عکس دیوان غالب، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ابتدا میں شائع ہو چکا ہے۔

اعلان کے لائق نہ تھے وہ نکال دیے گئے مگر اس خط اور چند خطوں کی عبارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عود ہندی کے بعض خطوں کی کچھ عبارتیں قطع و برید کی زد میں ضرور آ گئی ہیں۔

اس موقع پر میں جناب قاضی محمد خلیل صاحب رئیس اعظم بریلی کا تہ دل سے شکر ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس معاملے میں میرے ساتھ نہایت دریا دلی سے کام لیا ہے۔

عود ہندی کی ترتیب میں اگر چہ خواجہ صاحب نے بذات خود بہت کوشش کی اور مرزا نے بھی اس میں ان کی مدد کی، تاہم یہ کل 168 ہی خطوں کا مجموعہ بن سکا۔ وجہ یہ کہ بہت سے خطوط کتاب کی ترتیب کے وقت مل نہ سکے تھے اور کچھ خط ایسے ایسے بھی تھے جن کا شائع کرنا مناسب نہ سمجھا گیا اور اس لیے وہ خارج کر دیے گئے۔ خیر جو کچھ ہو سو ہو۔ ان تمام خطوط کی ترتیب پر جب ہم علمی اور ادبی حیثیت سے غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فصلوں کے بہت سے خطوط اور خصوصاً ابتدائی خطوط کما حقہ سمجھنا سمجھانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیوں کہ یہ خطوط ایسے خطوط کے جواب میں ہیں جن میں کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے گئے ہیں یا کوئی تحقیق طلب مسئلہ فارسی یا اردو کا دریافت کیا گیا ہے۔ ''عود ہندی'' کے سارے خطوں پر تبصرہ کرنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں اس لیے فصل اول کے پہلے خط کی صرف چند سطریں بطور نمونہ یہاں نقل کی جاتی ہیں:

> ''چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی، ورنہ میں سزاوار ستایش نہیں ہوں۔ ایک سپاہی زادۂ ہیچ مداں اور پھر دل افسردہ، دروں فرسودہ۔ ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرواز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائیے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں اور ان کا کلام وحی ہے۔ اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔ اِسی

چھاپے میں کہ جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں من کہ باشم عقل کل الخ۔ اس شعر کی
شرح کو ملاحظہ کیجیے۔ عبارت دو تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں
جاتا اور غور و تامل کے بعد سمجھ لیجیے تو وہ معنی ہرگز لایق اس کے نہیں ہیں کہ فکر سلیم
اُس کو قبول کرے۔ پھر احسان تو بشگافتہ الخ۔ اس مصرعہ کی توجیہ کتنی بے مزہ
اور بے نفع ہے۔ عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اس سے پوچھوں کہ بھائی تو نے اس
شعر کے کیا معنی رکھے ہیں۔''

عود ہندی کے کسی اڈیشن پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کسی ایک مکتوب الیہ کے سب خط ایک ہی جگہ نہیں ہیں۔ کتابت کی تاریخوں کے سلسلے سے بھی خطوں کی ترتیب نہیں ہوئی ہے بلکہ کتاب کے ترتیب دینے والوں نے تاریخوں کو سراسر حذف کر دیا ہے۔ چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی مرحوم کے نام جو خط ''عود ہندی'' میں درج ہیں اُن میں سے بعض کے اصل نسخے محفوظ ہیں اور ان میں کتابت کی تاریخ موجود ہے۔ (جیسے خط 142۔ 20/نومبر 1855ء، خط 174۔ 30/جون 1861ء، خط 149۔ 29/اپریل 1859ء)۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ بے ترتیبی کیوں کر واقع ہوئی۔ غالب یہ ہے کہ کتاب کے ترتیب دینے والوں میں سے ہر ایک کو جس سلسلے سے خطوط ملتے گئے اسی سلسلے سے وہ مجموعے میں شامل ہوتے رہے اور اسی ترتیب سے کتاب شائع ہوئی۔ مثلاً خواجہ صاحب کے نام مرزا غالب کا ایک خط یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا 'عود ہندی' میں شامل کیے جانے کے لیے خطوں کو جمع کر کے بھیجتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حق التصنیف کی جلدیں بھی طلب کر رہے ہیں۔

''پیر و مرشد کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ کلکتہ میں مولوی عبدالغفور خاں
ان کا نام اور نساخ اُن کا تخلص ہے۔ میری اُن کی ملاقات نہیں۔ اُنھوں نے اپنا
دیوان چھاپے کا موسوم بہ ''دفتر بے مثال'' مجھ کو بھیجا، اُس کی رسید میں یہ خط میں
نے اُن کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثر اُردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال
کرتا ہوں اور ہاں حضرت وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم، چھپ چکا ہو تو حق
التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو

بھیجئے۔ والسلام۔"

اِسی کے بعد مولانا نساخ کے نام کا یہ خط[1] درج ہے:

"جناب مولوی صاحب قبلہ یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم باسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے مکرمت حال کا شاکر اور آیندہ افزایش عنایت کا طالب ہے۔ دفتر بے مثال کو عطیۂ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ الخ۔"

عود ہندی میں منشی غلام بسم اللہ کے نام کا خط سب کے آخر میں ہے اس کے قبل مرزا کی لکھی ہوئی دو تقریظیں اور تین دیباچے ہیں پھر ان تقریظوں اور دیباچوں کے قبل خطوط ہی خطوط ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ترتیب میں منشی غلام بسم اللہ کے نام کا خط تقریظوں اور دیباچوں کے بعد کیوں ہوا۔ میرے نزدیک یہ بات یوں ہے کہ منشی صاحب میرٹھ میں ناظر تھے۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب کو اُن کے نام کا خط اُس وقت ملا ہوگا، جب کہ عود ہندی قریب قریب چھپ گئی ہوگی۔ اس لیے منشی صاحب نے اُس کو آخر میں جگہ دے دی۔

عود ہندی کی پہلی فصل کا مسودہ خواجہ صاحب کے پاس چودھری عبدالغفور سرور نے بھیجا ہے لیکن دوسری فصل کے باب میں سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کا کس قدر مواد خواجہ صاحب نے اپنی طرف سے جمع کیا ہے اور کس قدر مرزا کی مدد سے ان کے پاس پہنچا۔ اس کے باب میں یہ جاننا چاہیے کہ خواجہ صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھ پور اور اکبرآباد سے تحریریں فراہم کیں[2] اس کی بنا پر یہ ضرور ہے کہ موسومہ ذیل حضرات کے نام کے خطوط خواجہ صاحب نے بذات خود جمع کیے، البتہ یہ ممکن ہو کہ ان کی فراہمی میں منشی محمد ممتاز علی صاحب سے مدد ملی ہو:

1۔ نواب اور انورالدولہ سعدالدین شفق (کالپی)

2۔ مرزا حاتم علی مہر (آگرہ)

3۔ مرزا رحیم بیگ (میرٹھی)[3]

1۔ عود ہندی۔ خط 113۔ 2۔ فغان بے خبر، ص 82۔ 3۔ ان کے نام جو ایک خط "عود ہندی" میں ہے "وہ قاطع برہان" کے مباحثے کے زمانے میں الگ چھپ چکا تھا۔ (ادارہ)

4۔ مولوی عبدالرزاق شاکر[1] (گورکھ پور)

5۔ قاضی عبدالجمیل (بریلی)

6۔ مفتی سید محمد عباس (لکھنؤ)

7۔ خواجہ صاحب

8۔ مولوی عزیزالدین

9۔ منشی مردان علی رعنا

10۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

خواجہ صاحب چونکہ اس صوبے کے اعلیٰ حاکم کے میر منشی تھے اور ایک معروف ادیب بھی تھے لہٰذا اس صوبے سے تعلق رکھنے والی تحریروں کو وہ بآسانی اکجا کر سکے، باقی جس طرح مولوی عبدالغفور نساخ کے نام کے خط کا مسودہ خواجہ صاحب کے پاس مرزا نے خود بھیجا تھا اُسی طرح ممکن ہے کہ اِن حضرات کے نام کے خطوط کی نقلیں بھی مرزا غالب ہی نے خواجہ صاحب کو بھیجی ہوں جیسا کہ خواجہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ مرزا سے بہت کچھ حاصل کیا[2]:

1۔ مولوی عبدالغفور نساخ

2۔ میر مہدی حسین مجروح

3۔ میر سرفراز حسین

4۔ نواب علاءالدین خاں بہادر

5۔ منشی ہرگوپال تفتہ

6۔ مرزا یوسف علی خاں عزیز

7۔ حافظ از طرف ظہیرالدین

حقیقت یہ ہے کہ مرزا کے خطوط محض مزا لینے یا ادبی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے جمع کیے گئے اِس لیے ترتیب کتاب کے ذمہ داروں نے کتابت کی تاریخوں کو بے کار جان کو حذف

1۔ مولانا کا وطن مچھلی شہر ہے مگر اس زمانے میں گورکھ پور میں مقیم تھے۔

2۔ فغان بے خبر، ص82۔

کر دیا اور اسی سلسلے میں اکثر اُن معنی خیز فقروں کو بھی حذف کر دیا جو مرزا غالب اپنے خط کے خاتمے میں حسب موقع و محل لکھا کرتے تھے مثلاً مرزا کا ایک خط[1] بنام قاضی عبدالجمیل صاحب یوں ہے:

''پیر و مرشد نواب صاحب وظیفہ خوار گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں۔ 13/ اکتوبر کو یہاں پہنچا بشرط زندگی آخر دسمبر دہلی کو جاؤں گا۔ نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں۔ خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الہ الا اللہ لا موثر فی الوجہ الا اللہ۔

نجات کا طالب غالب

سہ شنبہ 7/ نومبر سنہ 1815۔

لیکن اس کے خاتمے کے یہ لطف آمیز الفاظ 'نجات کا طالب غالب' مطبوعہ خط میں درج نہیں۔

قصہ کوتاہ عود ہندی میں جو غلطیاں اور علمی و ادبی یا ترتیب وغیرہ کی جو خرابیاں ہیں اگر ابتدا ہی میں اُن کی روک تھام ہو گئی ہوتی تو جس قدر فائدہ ہم اُس سے اُٹھا رہے ہیں اُس سے کہیں زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے۔ اگر اب بھی کوشش کی جائے تو بہت کچھ اصلاح ممکن ہے مگر اس طرف سے بے پروائی کی گئی ضروری مواد تھوڑے دنوں میں یقیناً ضائع ہو جائے گا۔

(تماہی رسالہ ''ہندوستانی''، بمبئی، اپریل 1934ء)

1۔ 751 (عود ہندی)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی
ایم ۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

غالب کے خطوں کے لفافے

''غالب'' کے خطوں اور رقعوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِن کے لکھنے والے کو نامہ نگاری کا کیسا شوق تھا اور وہ خط کتابت میں کیا کچھ اہتمام کرتا تھا۔ بعض خطوں کو پڑھ کے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص جیتا ہی اِس اُمید پر تھا کہ بیٹھا دوستوں کو خط لکھا کرے۔ اوروں کی کوتاہ قلمی کی شکایت قدم قدم پر کرتا ہے۔ اپنے جلد جلد خط لکھنے اور بلا تاخیر جواب دینے کی ہر موقع پر داد چاہتا ہے۔ کبھی کسی اور سے خط کی نقل کروا کے رکھ چھوڑتا ہے۔ کبھی مکتوب الیہ ہی سے فرمائش ہے کہ نقل لے کر میرا خط مجھے واپس بھیج دینا۔ کبھی تو ڈاک میں تلف ہو جانے کے ڈر سے خط بیرنگ بھیجتا اور مکتوب الیہ کو ہدایت کرتا ہے کہ تم بھی بیرنگ بھیجا کرو[1]۔ کبھی ڈاک خانے والوں سے رسم پیدا کرتا اور اپنے مکتوب الیہ کو یوں لکھتا ہے:

> ''پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے؛ جو دوست خط لکھتا ہے وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے۔''[2]

ایک شاگرد کو بگڑ کر لکھتا ہے:

> ''ملک مغرب، بلدۂ دہلی، کٹرۂ رودگراں، یہ کیا لکھا کرتے ہو؟ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ محلہ غلط، ملک زائد، ہندوستان میں دلی کو سب جانتے ہیں، اور دلی میں مجھ کو سب پہچانتے ہیں۔''[3]

---

1. رسالہ ''اُردو'' ج 14، ص 195۔
2. عود ہندی (آگرہ 1910ء)، ص 156۔
3. رسالہ ''ہندوستانی''، ج 3، ص 476۔

ایک دوست کو لکھتا ہے:

''وطن کو جاؤ؛ لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتا لکھنا تا کہ میں اُس نشان سے تم کو خط بھیجوں۔''[1]

اسی دوست سے کوتاہ قلمی کا شکوا کیسے خوب پیرائے میں کرتا ہے:

''صاحب میں نے اودھ اخبار میں دیکھا کہ چھوٹے صاحب مقدمہ جیتے...... میں تو تہنیت میں خط لکھوں گا؛ مگر رشک آتا ہے کہ بہ حوالۂ 'اودھ اخبار' لکھوں اور بہ حوالۂ سیف الحق نہ لکھوں۔''[2]

''جس شخص کو خط کتابت سے اِس درجے کی دل چسپی ہو جس نے خطوط نویسی کو اچھا خاصا ایک فن لطیف بنا دیا ہو، اُس کے خط کے لفافے کیسے ہوتے ہوں گے اور اُن لفافوں پر پتا لکھنے کا کیا انداز ہوگا؟'' یہ سوال اکثر ذہن میں آیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ جواب:

''افسوس، لفافوں کو محفوظ رکھنے اور ہم تک پہنچانے کا اِن مکتوبات کے جمع کرنے والوں نے کچھ خیال نہ کیا، اِس مایوسی میں ''عود ہندی'' اور ''اردوے معلیٰ'' کی ورق گردانی جو کی تو لفافوں کا نشان ملا۔ مطبع مفید خلائق، آگرہ کے مہتمم، منشی شیونرائن سے ارشاد ہوتا ہے:

''لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے؛ بے کار آدمی کیا کرے۔ بہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجالائیں گے۔

ع۔ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔''[3]

منشی شیونرائن بچارے نے لفافے چھپوا، بنوا کے بھیجے مگر وہ کاہے کو حضرت کے پسند آتے۔ سن لیجیے:

''برخوردار، آج اِس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا؛ دل خوش ہوا۔ بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں: یہ لفافے، از مقام و در مقام،

---

1. مکمل اردوے معلیٰ، ص 22۔ 2. اردوے معلیٰ، ص 24۔

3. اُردوے معلیٰ، ص 259۔

یہ 'تاریخ' و 'ماہ' مجھ کو پسند نہیں۔ آگے جو تم نے بھیجے تھے، وہ بھی میں نے دوستوں
کو بانٹ دیے۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اِس مراد سے بھیجتا ہوں کہ اِن کے عوض
یہ لفافے جو 'در مقام' و 'از مقام' سے خالی ہیں، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے
ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اُس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اور اگر اس طرح کے
لفافے نہ ہوں تو اُن کی کچھ ضرورت نہیں۔''[1]

معلوم ہوا کہ کسی عبارت بلکہ کسی لفظ کا بھی لفافوں پر چھپوانا مقصود نہ تھا؛ مگر یہ نہیں کھلتا کہ پھر کیسے لفافے چاہتے ہیں، جن کے لیے آگرے کے چھاپے خانے سے یہ خط کتابت ہو رہی ہے۔ ہمیں منشی مہیش پرشاد صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے جن کی کوشش سے غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک ہی دو نہیں، چوبیس لفافے دیکھنے کو ملے؛ ایک کا عکس اور تیئیس اصل۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ اِن چوبیس لفافوں میں سے سات کے حاشیوں پر طرح طرح کی سیاہ قلم بیلیں اور مداخل چھپے ہوئے ہیں اور اُن کے اندر پتا اور 'در مقام' و 'از مقام' اور 'تاریخ' و 'ماہ' سب کچھ حضرت کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ یہ تھے وہ لفافے جن کی فرمائش تھی۔

وہ ایک لفافہ جس کا عکس منشی صاحب نے حاصل کیا ہے، مجی صلاح الدین خدا بخش مرحوم و مغفور کے قبضے میں تھا؛ اُن کی ناوقت موت کے بعد اُن کی کتابوں کے بیش بہا ذخیرے کے ساتھ بانکے پور کے کتب خانۂ خدا بخش میں داخل ہوا۔ باقی تیئیس لفافے، جو سب کے سب قاضی عبدالجمیل صاحب مرحوم ''جنون'' بریلوی کے نام لکھے گئے تھے، اُن کے بیٹے جناب قاضی محمد خلیل صاحب زاد مجدہ نے منشی مہیش پرشاد صاحب کو اشاعت کے لیے مرحمت فرمائے۔ منشی صاحب نے مجھ پر کرم فرما کر مجھے اِن کے شائع کرنے کی اجازت دی، جس کے لیے میں اُن کا شکر گذار ہوں۔

قاضی صاحب مرحوم کے نام کے لفافوں پر بعد کو کسی نے شمار کے ہندسے لگائے ہیں اور اِس میں تاریخوں کی تقدیم تاخیر کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ غلطی سے دو لفافوں پر 'ایک' کا ہندسہ پڑ گیا ہے؛ تین پر کوئی ہندسہ نہیں ہے۔ وہ لفافے، جن پر 4، 5، 9، 16، 17، 19، 20، 22، 23، 26، 28، اور 29 کے ہندسے پڑے ہوں گے، موجود نہیں ہیں۔ اخیر ہندسہ 31 ہے اور اِس لفافے پر روانگی

---

1. اُردوے معلّٰی، ص 71-270۔

کی تاریخ 9/اکتوبر 1864ء لکھی ہے۔ اِس تاریخ کے بعد کے بھی دو لفافے موجود ہیں: ایک 7/نومبر 1865ء کا، دوسرا 16/اکتوبر 1866ء کا لکھا ہوا۔ اِن لفافوں میں سب سے پرانا وہ ہے جس پر 12/اکتوبر 1853ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے؛ مگر قاضی صاحب کے نام ایک خط ''پنج آہنگ'' میں بھی ہے اور اُس کی کتابت کی تاریخ 28/صفر 1269ء ہے (یعنی 11/دسمبر 1852ء) اور غالباً یہی سب سے پہلا خط ہے جو مرزا غالب نے قاضی صاحب کو لکھا۔ اِس حساب سے غالب نے اپنے مرنے سے سوا دو برس پہلے تک قاضی صاحب کو کم سے کم چھتیس خط بھیجے تھے؛ مگر ''پنج آہنگ'' اور ''اُردوے معلّیٰ'' اور ''عود ہندی'' میں سب ملا کر کل اٹھارہ ہی خط ہیں۔ اِس کمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی کا کلام اِصلاح کے لیے آتا تھا تو اصلاح کے بعد وہ لفافے میں رکھ کے واپس کر دیا جاتا تھا؛ اُس کے ساتھ کسی خط کا ہونا ضروری نہ تھا۔

افسوس ہے کہ اِن لفافوں کے اندر جو خط یا کاغذ تھے وہ بیشتر ضائع ہو گئے۔ صرف پانچ کاغذ باقی رہ گئے ہیں جن سے ''ہندستانی'' کی کسی اگلی اشاعت میں بحث کی جا سکے گی۔

موجودہ لفافوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جس طرح اپنی اِنشا میں اکثر زوائد کو ترک کر دیا تھا، لفافے پر پتے کی جو عبارت لکھا کرتے تھے اُس میں بھی رفتہ رفتہ بہت اختصار کر دیا تھا۔ اِن لفافوں کو سلسلہ وار دیکھنے سے اِس تدریجی اِصلاح کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔ اِس لیے آئندہ صفحوں میں سب پتے نقل کیے جاتے ہیں۔ صرف اُن لفافوں کی نقل نہیں دی گئی جن کے عکس اس مضمون میں شامل ہیں اور جن کی پوری عبارت عکس میں آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اُس زمانے کے دستور کے خلاف غالب کبھی کبھی پتا، بجائے فارسی کے اردو عبارت میں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ اِن چوبیس میں تین لفافے ایسے ہیں (عکس د، ہ، م) جن پر پتا اردو میں لکھا ہے۔ غالب کے بعض خطوں میں تاریخ نہیں ہے مگر لفافے پر ضرور تاریخ لکھتے تھے۔ صرف ایک لفافے پر، جو دستی بھیجا گیا تھا (عکس ی)، تاریخ نہیں ہے۔ قاضی صاحب، بریلی سے کہار کے ہاتھ آم بھیجا کرتے تھے۔ غالب شکریے کا خط لکھ کر اُسی کہار کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں[1]:

---

[1] اُردوے معلّیٰ، ص158: عود، ص157۔

> ''سبحان اللہ! سرآغاز فصل میں ایسے ثمرہاے پیشرس[1] کا پہنچنا نوید ہزار گونہ میمنت وشادمانی ہے۔...... جمعے کے دن دوپہر کے وقت کہار پہنچا۔ اُسی وقت خط کا جواب اور آم کے دو خالی ٹوکرے دے کر روانہ کیا......''[2]

عجب نہیں کہ یہ لفافہ اِسی خط کا ہو۔

کچھ لفافے ایسے بھی ہیں جن پر خط کے پہنچنے کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ غالباً مکتوب الیہ کبھی کبھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ایک لفافے کی تاریخ کا اخیر حصہ ضائع ہوگیا ہے (عکس و) مگر رسید کی تاریخ سے سنہ دریافت ہوتا ہے۔

یہاں لفافوں کی نقلیں دی جاتی ہیں، اس التزام کے ساتھ کہ:

(الف) سلسلے کے شمار کے بعد قوسین میں وہ ہندسہ دے دیا گیا ہے جو اُس لفافے پر بعد کو کسی نے ڈال دیا ہے۔ اگر لفافے پر کوئی ہندسہ نہیں ہے تو قوسین میں چلیپا بنا دیا گیا ہے۔

(ب) جو لفظ یا حرف کاغذ کے پھٹ جانے سے ضائع ہو گئے ہیں اُن کو، جہاں تک ممکن ہوا، پورا کرکے کہنی دار خطوں میں رکھا ہے۔

(ج) جن لفافوں کے عکس دیے گئے ہیں اُن کی نقل نہیں دی گئی ہے، بلکہ عکس کا حوالہ دے دیا گیا ہے مگر جن میں کوئی لفظ یا حرف ضائع ہو گیا ہے اُن کی پوری یا ضروری حصے کی نقل بھی دے دی گئی ہے۔

1 (1): عکس (الف) — 12/ اکتوبر 53ء[3]

2 (1): عکس (ب) — 21/ اکتوبر 53ء[3]

3 (2): عکس (ج) — 26/ اکتوبر 54ء[3]

---

1. ''عود'' میں ''بیشرس'' ہے، جو صحیح نہیں۔
2. ایک اور خط میں ہے: ''دس قلمیں اور چھٹانک بھر سیاہی کہار کے حوالے کر دی ہے۔ خدا کرے بہ حفاظت آپ کے پاس پہنچے'' (اردوے معلیٰ، ص 155۔)
3. عبارت کے ختم پر جو علامت ہے وہ ''فقط'' کی مخفف شکل ہے، جو اکثر پانچ کے ہندسے کے مماثل لکھی جاتی تھی۔

4(3):عکس (د):—

(شہر بریلی سوجے خاں کا گھیر[1] پرانے قلعہ اور مسجد (جامع کے) قریب مرزا غلام قادر بیگ کے مکان پر پہنچ کر مخدوم مکرم مولوی عبدالجمیل صاحب کو پہنچے از اسد من مقام دہلی مرسلۂ دہم نومبر سنہ 1854ء پوسٹ پیڈ۔[2]

5(6):

در شہر بریلی کٹرہ مان رائے بدوکان حافظ احمد حسین صاحب سوداگر موصول و بخدمت مخدومی مکرمی مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد از اسد مرسلۂ شنبہ یکم دسمبر سنہ 1855ء پوسٹ پیڈ۔[3]

6(7):

در بریلی بہ کٹرہ مان رائے بہ دکان حافظ احمد حسین صاحب سوداگر موصول و بخدمت مخدوم مکرم مولانا قاضی عبدالجمیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد از اسد مرسلہ (............) سنہ 1856 پوسٹ پیڈ۔

7—(x):عکس (ہ):

شہر[4] بدایوں میں فرشوری ٹولہ محلّہ میں جناب مولوی اساس الدین صاحب کے پاس پہنچ کر (اون کے ذریعہ) سے میرے شفیق عنایت فرما مولوی عبدالجمیل صاحب کو پہنچے از غالب یکرنگ بیرنگ[5] مرسلۂ چہارم جون سنہ 1858ء۔

8(8):

در شہر بانس بریلی موصول و بخدمت قاضی صاحب شفیق مکرم و مخدوم معظم قاضی عبدالجمیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد مرسلۂ اسد اللہ روز جمعہ 17/دسمبر سنہ 1858ء اسٹامپ پیڈ۔

---

1. یعنی ''احاطہ''۔ رہیلکھنڈ کے شہروں میں یہ اصطلاح بہت عام ہے۔

2. ایضاً ایضاً 3. ایضاً ایضاً 4. یا شاید ''خط ہذا''۔

5. یہ لفظ غالب کے لیے نہیں، بلکہ خط کے لیے ہے۔

عکس (ز)

عکس (ح)

بریلی قاضی کا ٹولہ   ۱۹ محرم یکشنبہ ۱۲۶۳ھ   بیرنگ ضرور ہے

بخدمت مولوی صاحب مخدوم و مکرم مولوی عبد الحبیب صاحب زاد مجدہٗ   موصول باد

عکس (ط)

9(10):
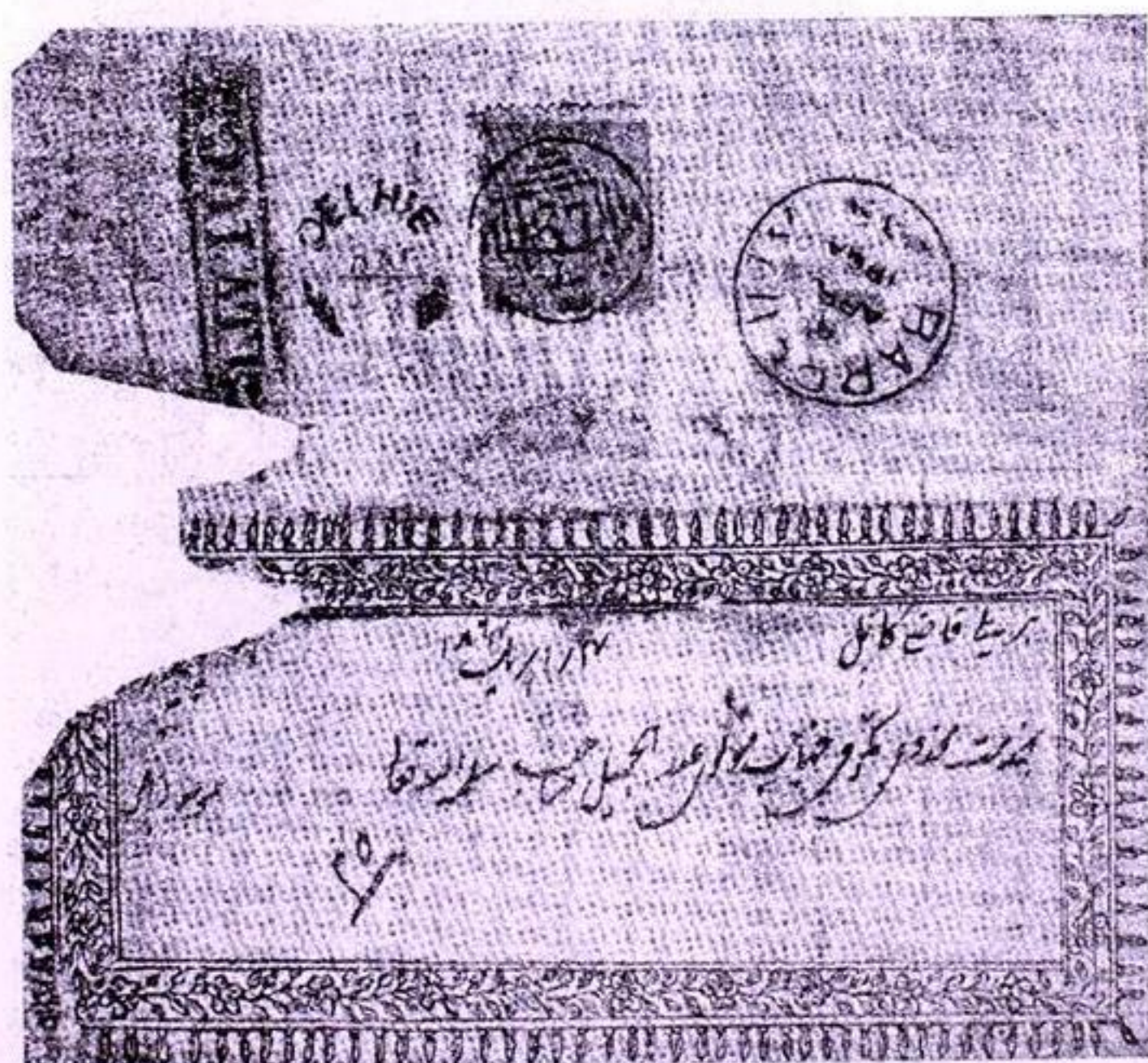
دربیسلپور بحکمۂ منصفی موصول و بخدمت مولوی صاحب مخدوم مکرم مولوی قاضی عبدالجمیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد از غالب مرسلۂ جمعہ 29/ اپریل سنہ 1859ء بصیغۂ اسٹامپ پیڈ 12۔

10(11) عکس (و):

یک شنبہ 28/ ماہ اگست (سنہ 1859ء)

.................مقبول (باد)

11(12):

***[1] ** یوم الخمیس 8/ ستمبر سنہ 1859ء

بخدمت مولوی صاحب شفیق مکرم و مخدوم معظم جناب مولوی قاضی عبدالجلیل[2] صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد

12(13):

*** 27/ جنوری سنہ 1861 غالب یکرنگ بیرنگ

بخدمت مولوی صاحب مخدوم مکرم و معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد۔

13(14):

*** 22/ فروری سنہ 1861 غالب یکرنگ بیرنگ

بخدمت مخدوم مکرم و مطاع معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب امین منصفی بیسلپور سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد۔

14(15): عکس (ز)—30/ جون سنہ 61[3]

---

1. ان نشانوں سے یہ مراد ہے کہ یہاں بھی وہی لفظ ہیں جو عکس (و) میں ان مقامات پر ہیں۔
2. یہاں دھوکے سے 'جمیل' کی جگہ 'جلیل' لکھ گئے ہیں۔
3. مگر دلی کے ڈاکخانے کی مہر میں '29/ جون 61' ہے، ٹکٹ کے نیچے 'غالب' لکھا ہے اس طرح سے کہ لام کی نوک اور بے کا اخیر حصہ ٹکٹ کے اوپر آ گیا ہے۔

15(18): عکس (ح)—19/جون سنہ 1862ء۔

16(21):

بریلی قاضی کا پل   7/جنوری سنہ 1864   پیڈ ضروری

بخدمت مخدومی مکرمی جناب مولوی عبدالجمیل صاحب زادمجدہ موصول باد

17(24):

بریلی قاضی کا پل   19/مارچ سنہ 1864ء[1]   پیڈ ضروری

بخدمت مولوی صاحب مخدوم مکرم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ تعالیٰ فائز باد۔

18(25): عکس (ط)—4/اپریل 1864ء[2]   پیڈ (ض) ر (وری)

19(27): عکس (ی)—(مظ) ہر.......... مجد (ہ)

20(30): عکس (ک)—24/اگست سنہ 1864[3]

21(31): (بیلدار حاشیہ):

بریلی مسجد جامع قاضی کا پل   9/اکتوبر سنہ 1864   پیڈ ضروری

بخدمت شفیقی مکرمی مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد۔

22(×): عکس (ل)—7/نومبر سنہ 1865۔

23(×): عکس (م)—16/اکتوبر سنہ 66۔

24: عکس (ن)

یہ خط میر ولایت علی مہتمم عظیم المطابع پٹنہ کے نام ہے اور غالباً 1865ء میں لکھا گیا تھا۔ داہنی طرف نیچے کے گوشے میں ''6/ماہ اپریل'' لکھا ہوا ہے اور اُس کے نیچے '65' کا ہندسہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈاک خانے کی مہر ان لفظوں

---

1. ٹکٹ کے اوپر 'اسد' لکھا ہوا ہے۔
2. ٹکٹ کے اوپر 'غالب' لکھا ہوا ہے
3. ٹکٹ کے اوپر 'اسد' لکھا ہوا ہے۔

عکس (ی)
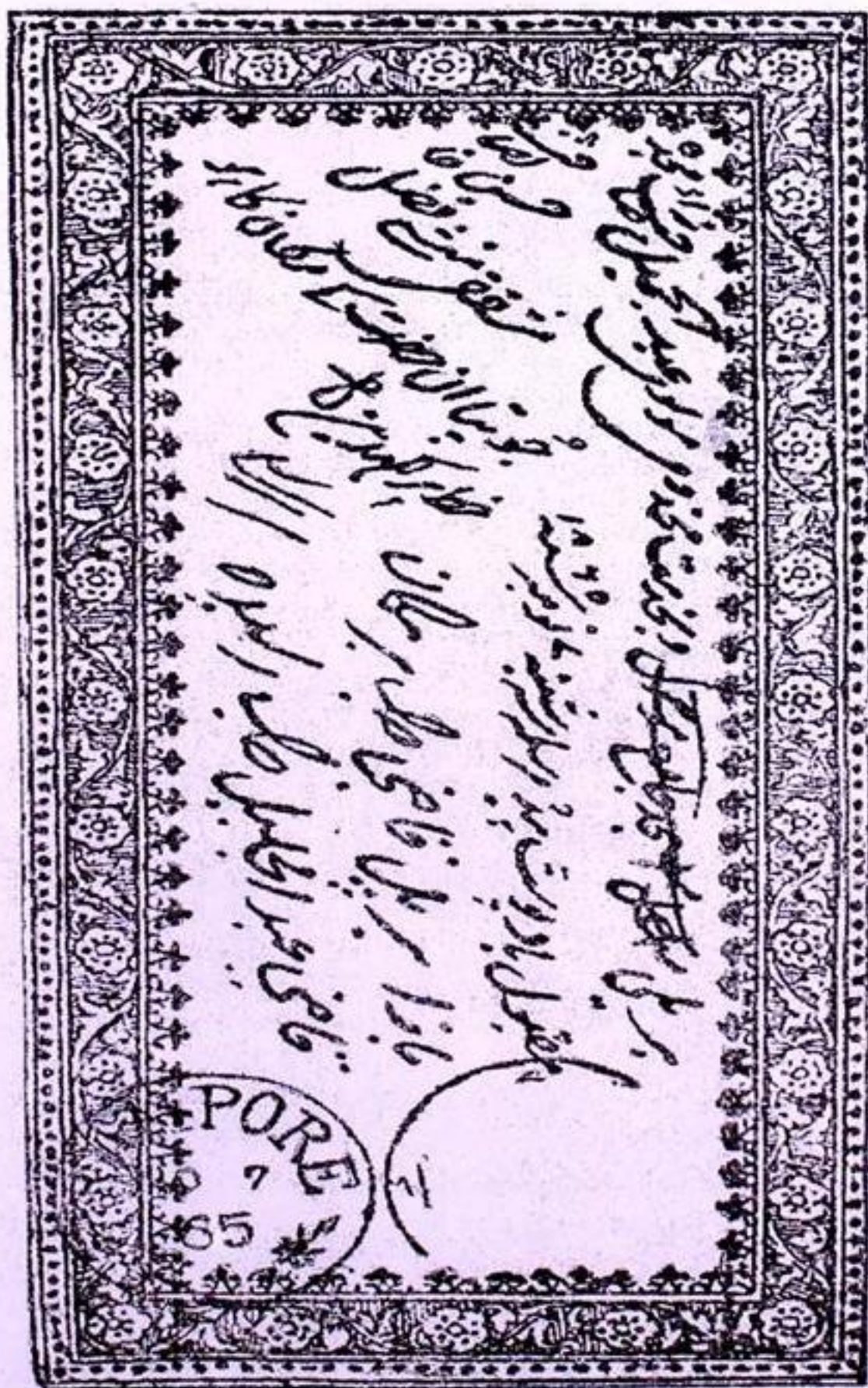
عکس (ک)

عکس (ل)

عکس (م)

عکس (ن)

عکس (ن)

پر پڑی ہے اور '65' کے اوپر اپریل کے حرف AP آ گئے ہیں جن کی وجہ سے خاص کر '5' کا ہندسہ مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔اسی گوشے میں بائیں جانب کو ذرا ہٹ کر غالب کی مہر ہے:

''غالب 1278''

یہ وہی مہر ہے جس کا عکس ''ہندستانی'' کی پچھلی اشاعت میں (ص 98 کے مقابل) موجود ہے۔

(تماہی رسالہ ''ہندوستانی''، بمبئی، اپریل 1934ء)

برج موہن دتاتریہ کیفی

غالب اور اردو خطوط نویسی

تحقیق کچھ عجیب چیز ہے۔ وہ بت ساز بھی ہے اور بت شکن بھی ہے۔ دنیائے فکر و عمل میں کتنے سالمات تھے جو سالبات ہو کر رہ گئے اور اسی طرح سالبات سے سالمات وجود پذیر ہوئے۔ دنیا میں جتنی چیزیں انت ہیں، ان میں تحقیق بھی شامل ہے۔ اگر کوئی انسان واقعی محقق ہے یعنی تعصب نفس سے مبرّا ہے تو وہ تحقیق کے کسی نتیجے کو آخری لفظ ہرگز نہیں کہے گا۔

تحقیق یا ریسرچ کے طریقوں کی پرواز انسانوں کی شخصی کیفیت نفسی سے رنگ تو لیتی ہی ہے مگر ملکی اور کلچرل خصائص سے بھی بہت کچھ متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں یعنی مشرقی ملکوں میں اخلاق عامہ کی تحلیل نفسی کی جائے تو ثابت ہوگا کہ قدامت پرستی کا عنصر ہماری رائے اور تحقیق پر بے حد حاوی اور عامل ہے۔ کبھی اسے پاسِ وضع اور نباہ کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی اعتقادی استقامت کا سہرا اس کے سر باندھا جاتا ہے۔ اور جگہ یہ حالت نہیں ہے، اور اسی لیے وہ نئی نئی حقیقتیں اور قوانینِ قدرت دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

آج میں زیرِ زمین یا عالم بالا سے متعلق کوئی فلسفیانہ یا علمی مسئلہ پیش کرنے کو نہیں ہوں بلکہ اردو ادبیات کی ایک شق ''غالبیات'' سے متعلق صرف ایک امر کا ذکر کروں گا جو ادبی تحقیقات کے سلسلے میں میرے علم میں آیا ہے۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرزا غالب خطوط کے نئے طرز تحریر کے موجد ہیں۔ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مرزا خود اس ایجاد کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسی دعوے پر انتقادی نظر ڈالنا مقصود ہے۔ مرزا کا وہ خط جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے، ان کے خطوط کے تمام مجموعوں میں

موجود ہے۔اس پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے مگر خط کے مضمون سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔ پہلے اس خط کی پوری نقل دی جاتی ہے جو مرزا حاتم علی مہر کے نام ہے۔

نقل خط

''مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے، اتنا تو کہو یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھرس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہوگئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلد بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے۔ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئیں گی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان پینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیا کرتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرواز بھی ہے، ایک

غزل میری کہیں سے لکھوالایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا، غزل تم کو بھیجتا ہوں۔

درد منّت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

غزل کے مقطع کے ساتھ یہ خط ختم ہوتا ہے۔ تاریخ تحریر درج نہیں۔ مگر اس کی تعیین بالجملہ بہت آسان ہے۔ غدر 1857ء کا ہنگامہ ختم ہو چکا ہے۔ مرزا غالب ''دستنبو'' لکھ چکے ہیں اور آگرے میں چھپوانے کے لیے منشی شونرائن کے پاس بھیج چکے ہیں۔ کتاب یا کتابوں سے مُراد دستنبو ہی ہے جس کی لوح وغیرہ سے متعلق مرزا کے متعدد خط منشی نبی بخش حقیر وغیرہ کے نام ہیں۔ ان دنوں مرزا کے یہ چاروں دوست اور شاگرد آگرے میں تھے۔ منشی شونرائن تو وہاں کے رئیس ہی تھے۔ مرزا حاتم علی مہر وہاں وکالت کرتے تھے اور منشی نبی بخش کسی عدالت میں سررشتہ پر مامور تھے۔ مرزا تفتہ بھی ان دنوں آگرے گئے ہوئے تھے۔ مرزا غالب نے دستنبو کی تیاری کے سلسلے میں ان چاروں کو فرداً فرداً اور کبھی مشترکہ طور پر کئی خط لکھے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خط جس کی نقل اوپر کی گئی 1858ء کا لکھا ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطوط نویسی میں مرزا کی ایجاد کی تاریخ اس خط کی تحریر سے قائم کی جائے یا اسے کچھ پہلے کے زمانے سے وابستہ کیا جائے۔ اس کے لیے مرزا کے اردو خطوں کا ترقیاتی جائزہ ضروری ہے۔ اس بارے میں راقم نے اپنے دوستوں مثل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مسٹر مالک رام سے مشورہ کیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ امر کہ مرزا نے پہلا اردو خط کس تاریخ کو لکھا یا یوں کہیے کہ مستقل طور پر اردو میں خط لکھنا کب سے شروع کیا، ایک مسئلہ ہے جو کافی طور پر حل نہ ہو سکا۔ حالی لکھتے ہیں کہ جب مرزا مہر نیمروز لکھنے میں مصروف ہوئے تو انہوں نے اردو میں خط لکھنے شروع کیے اور مہر نیم روز کی تصنیف 1857ء میں شروع ہوئی۔ غالب خود ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ زیادہ محنت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اردو میں خط لکھنے لگا ہوں۔ خطوط کے مجموعوں کے جائزے سے جہاں تک پتہ چلا، یہ معلوم ہوا کہ غالب کے اردو خطوط مسلسل طور پر 1852ء تک پہنچتے ہیں۔ اس سے آگے منظر تاریک ہے۔ ممکن ہے کہ مزید تحقیق اس پر اور روشنی ڈال سکے۔

مرزا کی فہم وذکا، ذہانت اور فطانت بے شک تعریف کے قابل ہے۔ اکثر انسانوں کے ذہن ان اوصاف سے مزین نہیں ہوا کرتے۔ ماننا پڑے گا کہ مرزا کا ادبی شعور ایک خاص قسم کا تھا۔ خودنظری یا خود اصلاحی کا جوہر ان میں موجود تھا۔ اردو شاعری انہوں نے مرزا بیدل کو سامنے رکھ کر شروع کی۔ مگر ان کے آخری زمانے کا کلام اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح فارسی شاعری ایرانی استادوں کے کٹکھنوں سے شروع ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ کسب، اخذ اور ترقی کی غیر معمولی استعداد غالب کی طبیعت میں موجود تھی۔ مگر ایجاد کوئی اور چیز ہے۔ کامیاب تقلید یا ترقی کو ایجاد نہیں کہہ سکتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ 1836ء سے دہلی میں اردو کا لیتھو پریس قائم ہوگیا ہے۔ صرف دہلی سے کم سے کم دو اخبار نکلنے شروع ہوگئے ہیں۔ کتابیں چھپتی ہیں رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ادھر دوسری طرف مغربی ادب اور علوم کی تعلیم، نئی روشنی ملک میں پھیلا رہی ہے۔ لوگوں کی رغبت نئی باتوں اور نئے نظریوں کی طرف ہوتی جاتی ہے اور پرانی روایات نئی کسوٹی پر کسی جانے لگی ہیں۔ اس ماحول کو ادبی پہلو تک محدود رکھنا مقصود ہے۔ لوگ جو مغربی تعلیم سے حاصل کرتے تھے، اس کو تبرک سمجھ کر ابنائے وطن تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔

مرحوم دلّی کالج کے متعلم اور معلم ماسٹر رام چندر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس قدیم زمانے میں اردو کے تموّل کی ترقی میں اور لوگوں کو اصلاح و ترمیم کی طرف توجہ دلانے میں نمایاں کام کیا ہے۔ ماسٹر رام چندر انگریزی کے ماہر اور ریاضیات کے جید عالم ہوتے ہوئے اردو کی خدمت کا پُر جوش جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ وہ برسوں تک کئی رسالے اردو میں نکالتے رہے یہاں صرف ان کے ایک رسالے 'محبّ ہند' سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس رسالے کی جلد 29 بابت دسمبر 1849ء و جنوری 1850ء اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس نمبر کے صفحہ 46 سے جو عبارت نیچے نقل کی جاتی ہے۔ ہر مفکر اور بے تعصب ادیب کے غور وفکر کی مستحق ہے۔

"تمہ علوم در باب توہمات و رسوم طریقہ خط و کتابت"

"یہ ظاہر ہے کہ جب دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہیں اور اپنا مطلب ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں، اس میں سوا مطلب کی باتوں کے اور کچھ

نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی کو یہ کہتے نہیں دیکھا کہ: بعد گزارش تسلیمات فراواں وکور نشاط بے پایاں واستحصال ملازمت کثیر المباہجت و ملاقات مسرت ساعت فلاں کتاب مجھ کو عنایت کرو۔ بلکہ وقت خطاب کے نفس مطلب پر اکتفا کرتے ہیں۔ چونکہ دو شخص کہ تعارف رکھتے ہیں ہمیشہ ایک جا نہیں رہتے اسی واسطے ضروری پڑا کہ کوئی طریقہ مخاطبت واظہار مافی الضمیر کا جاری کیا چاہیے۔ لکھنے سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا، اسی لیے تحریر قائم مقام تقریر ہے۔ صرف مضمون جو وقت مخاطبت کے کہا جاتا ہے اسی کو لکھنا بھی چاہیے۔ چنانچہ دستور اہل عرب کا یہی ہے کہ کاغذ پر صرف سلام ومطلب لکھ دیتے ہیں۔ من فلاں ابن فلاں وکذا وکذا والسلام۔ ناگری میں بھی اہل ہند صرف مطلب سیدھی سیدھی طرح صاف صاف لکھ دیتے ہیں مع سمت و تاریخ۔ انگریزی میں بھی یہی دستور ہے کہ ضرورت سے زیادہ خط میں اور واہیات ومنشات داخل نہیں کرتے۔ سوائے حضرات فارسی بازوں کے جنہوں نے موافق اپنی عادت کے سب چیزوں کو بگاڑا تھا، خط کو خراب کیا۔ اول میں خط کے لمبے چوڑے القاب بعد اس کے آداب تسلیمات وشرح اشتیاق پانچ چار دس بیس سطروں میں۔ بعد اس کے حال خیریت وعافیت چار سطروں میں۔ پھر شکایت نہ پہنچنے خط کی طرح طرح سے اور بیقرار ومضطر ہونا جس کا بالکل اثر نہیں ہوتا یا حال پہنچنے خط کا اور سرفراز و ممتاز ہونا۔ پھر کچھ تھوڑا مطلب بڑی عبارت میں یا بعضے خطوں میں سوائے امور مذکورہ اور کچھ بیان نہیں ہوتا۔ بعد اس کے سب آشنایوں کو اسامی وار سلام کہتے ہیں۔ اکثر امرا بلکہ عوام میں دستور ہے کہ مبادا دوسرا آدمی شکایت کرے، کچھ نہ کچھ لکھ کر جس میں مطلب کی ایک بات نہیں ہوتی۔ البتہ انشا پردازی اور عبارت آرائی میں حتی الوسع دریغ نہیں ہوتا بھیج دیتے ہیں۔ خطوط تہنیت وتعزیت کے دفتر ہوتے ہیں۔ بعضے خطوں میں دیکھا کہ مضمون نہایت عتاب کا ہے لیکن القاب وآداب سے شرف وعظمت اور اخلاق ومحبت

ٹپکتا ہے۔ عبارت مضمون کی یہ ہے کہ آں صادق الوداد فلاں امر نہایت قبیح
کردند آیندہ چناں نکنند ۔ واز صدور چنیں امر معلوم شد کہ آں مہرباں را با
ماعداوتے تامہ است۔ لیکن القاب میں مشفق مہربان کرم فرمائے مخلصان۔
مخلص اخلاص پرستان وغیرہ اور آداب میں بعد تمنائے حصول مواصلت کہ
حدے وپایانے ندارد واظہار لوازم تسلیم وعبودیت وغیرہ مندرج ہے۔ علاوہ یہ
کہ عربی وناگری وانگریزی میں ہر ایک چیز کا جو نام ہے وہ خط میں لکھا جاتا
ہے۔ بخلاف فارسی کہ اس میں خط کو عنایت نامہ وچنیں وچناں صدہا طرح کے
نام وعبارات صرف خط کے واسطے لکھے جاتے ہیں...... ایک جا تین خط سات
روز کے عرصے میں آئے۔ تینوں میں دو دو چار چار سطریں خیر وعافیت کی
مندرج تھیں۔ بار بار خیریت کے لکھنے کی کیا حاجت ہے...... خط کو نائب وخلیفہ
تقریر کا اختیار کیا تھا۔ نہ دفتر واسطے انشا پردازی واغلاق عبارات وصناعات
واستعارات کے جس کا فارسی والوں کو نہایت مرتبے میں خبط ہوگیا ہے۔ نفس
انشاء میں کچھ برائی نہیں بلکہ ایک فن شریف ہے لیکن اپنے مقام مناسب میں نہ
ہر جگہ، تقریر وتحریر وسلام وکلام میں دس سطریں لکھنی جس میں نفس مطلب ایک
سطر میں ہو تضیع اوقات ہے۔ ایک خط 23 سطر کا میں نے دیکھا جس میں مضمون
صرف اتنا تھا کہ قریب چار ساعت نوانقہ برغریب خانہ تشریف آرند۔ ہر چہ کہ
اس مضمون کو بھی بڑی دھوم دھام سے لکھا تھا۔"

اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ رسالہ یعنی "محبّ ہند" قلعہ میں ضرور جاتا ہوگا کیونکہ اس کے تقریباً ہر نمبر میں بادشاہ ظفر کی دو تین تازہ غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ چنانچہ اسی اشاعت میں جس میں سے خطوط نویسی کے متعلق مضمون ابھی نقل کیا گیا ہے، بادشاہ کی دو غزلیں عین مضمون مذکورہ کے بعد درج ہیں۔ عنوان ہے "غزلیات شاہ جمجاہ دہلی" ظاہر ہے کہ قلعے سے تعلق رکھنے والے اس رسالے اور ان غزلوں کو ضرور پڑھا کرتے تھے۔ ظن غالب یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ اور ان کی طبع وقاد نے اس سے ضرور اثر لیا ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ 1858ء میں وہ خطوط نویسی میں اپنے موجد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جیسا کہ انہوں مرزا مہر کے خط میں لکھا۔ اس کو محض ان کی انانیت اور خود بینی کہنا چاہیے۔ مرزا غالب ابن الوقت تھے۔ جب جیسا موقع دیکھا ویسی بات کہہ دی۔ سہرے کے وقت میدان صاف دیکھا تو بے تامل پکار اٹھے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

کیا دنیا اندھی تھی۔ سب نے جانا کہ یہ استاد ذوق کو چیلنج ہے۔ غالب و ذوق دونوں کے سہروں کا موازنہ حالی نے یادگار غالب میں صحیح ناقدانہ طور پر کیا ہے۔ مرزا کا معذرت کا قطعہ جو اس قضیے کے سلسلے میں ہے، سب کے سامنے ہے۔ بھئی اگر شاعری ذریعہ عزت نہیں ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اور اپنے آباء کے صد سالہ پیشے کو کیوں نہیں اختیار کر لیتے۔ اردو میں بات بنتی نہ دیکھی تو فارسی سے پناہ کے طالب ہوئے اور فرمایا کہ:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

دوسرے موقع پر عارف کے لیے لکھتے ہیں:

آں پسندیدہ خوئے عارف نام — کہ رخش شمع دود مان من است
جائے دارد کہ خویش را نازم — کہ فلانی ز پیروانِ من است
جاوداں باش اے کہ در گیتی — سخت عمرِ جاودانِ من است
اے کے میراث خوارِ من باشی — اندر اردو کہ آن زبانِ من است

اس موقع پر مرزا اپنی اردو کو میراث کے طور پر عارف کو دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیاروں کو اچھی اور پیاری چیزیں ہی دی جاتی ہیں۔ بے رنگ و بے مزہ چیزیں نہیں دی جاتیں۔

اردو دیوان میں ایک جگہ فرمایا ہے:

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مگر منشی نبی بخش حقیر کو 1852ء میں خط میں ایک اردو غزل بھیجتے ہیں اور انہی میر صاحب

موصوف کی بابت لکھتے ہیں۔

''بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔''

میرے خیال میں جس طرح مرزا غالب نے اپنی شاعری کی بابت دعوے کیے ہیں اسی طرح خطوط نویسی کے متعلق سمجھنا چاہیے۔

(ماہنامہ ''آج کل''، دہلی، ستمبر 1952ء)

غالب کے خطوط — صفیر بلگرامی کے نام

صفیر بلگرامی (1249 تا 1307ھ) غالب کے دوست، صاحب عالم مارہروی کے حقیقی نواسے تھے۔ ان کی شعر گوئی کا آغاز تو زمانہ طفلی ہی میں ہو چکا تھا اور غالب سے تعلق پیدا ہونے کے قبل تین چار استادوں سے اپنے کلام پر اصلاح لے چکے تھے۔ لیکن جب 1280ھ میں ان کا مارہرہ جانا ہوا تو وہاں انھوں نے غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا۔ انھیں بھی خواہش ہوئی کہ میں غالب کا شاگرد بنوں اور انھوں نے ایک فارسی خط، جس میں غالب سے استدعا کی گئی تھی کہ مجھے حلقہ تلامذہ میں داخل کیجیے، کچھ فارسی اردو کلام کے ساتھ مارہرہ سے غالب کی خدمت میں بھیجا۔ خط مذکور کی کچھ عبارات یہ ہیں:

''درآب وگل ایں بیدل کہ نمک مذاق ریختہ اند...... از بدو شعور ہم بہ ارث آبائی وہم بہ ہنجار طبع آزمائی باغزل سرائی سرے دارد۔ اما ایں شاہدیست شوخ وشنگ کہ در کنار کساں بمشکل جا گرم میکند نہ کہ جون من ناکس ہوش درسر دارد۔ اینہم خوبی تقدیر اوست چہ کند، مجبور است کہ افسونے چند از کلام بزرگاں خصوصاً جناب غالب معجز بیاں یاد دارم۔ بہ ہزار حیلہ تالب آغوش بیاں ے آرم۔ زیادہ ازیں عرصہ بحال تنگ وحوصلہ فراخ ہنوز در کنار گرفتن باقیست وحصول این مدعا دشوار تا کہ رشک نظیری وکلیم وغیرت صائب وسلیم ظہور ہنجار نظامی کردار نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب...... افسونے تازہ نہ برانگیزد و بہ رہنمائی ایں نابلد...... بنا بر خیزد...... بنا

براظہار بے استطاعتی خودغزلے چند فارسی واردو مے رسد بامعان نظر دیدہ ایں انگارہ را از رنگ اصلاح جلوۂ تازہ دادہ شود و بعد ازیں ایں گمنام درزمرۂ مستفیداں نگاشتہ آید کہ سرافتخارم برفلک ساید'' جلوہ خضر 277۔

اس خط کے ساتھ صفیر کے نانا صاحب نے جو سفارشی نظم ونثر کہی تھی درج ذیل ہے۔

''صاحب عالم[1] غفراللہ الاعظم سلام و دعا باآرزومند یہائے بے صدوانتہا مے رساندوایں دوبیت حالیہ میخواند:

اے لعل ز اشعار توشرمندہ گہرہم مشتاق توارباب دول اہل ہنرہم
لخت جگرم راکہ صفیر است تخلص خواہدزتوفیضِ سخن آں لخت جگرہم

غالب نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا اور اپنی مثنوی ابر گہربار بھیجی۔ خط جو بہ تاریخ دہم ذی الحجہ 1280ھ مارہرہ میں وارد ہوا تھا، یہ ہے:

''مخدوم مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے۔ مجھ کو حضرت برجیس فطرت جناب حضرت صاحب عالم سے نسبت اویسی ہے۔ غائبانہ حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے۔ آپ کی طرز نگارش نظماً اور نثراً درخشندگی جوہر طبع سے خبر دیتی ہے۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا۔ باوجود خواہش خدمت کیوں نہ بجالاؤں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں۔ مجموع ایک روق میں کیوں کر گنجائش پائیں۔ ناگزیر جو اس نظم ونثر میں ہے اس کو عرض کرتا ہوں۔ بسر[2] درآوردن مخلِ معنی، درآوردن کافی، شوردرسر[3] انگیختن ٹکسال باہر، ازسرانگیختن مناسب، نہ برانگیزونہ برخیزدفارسی ہند، برنخیزدونینگیزدفارسی عجم، برلفظ زائداور نون معنی نفی، لفظ زائد ماقبل کلمہ چاہیے۔ نالہ ہا کہ ازدل سر[4] برزدہ اند، یعنی چہ؟ غیرذوی الروح بل کہ غیرذوی العقول کی جمع کی خبر بصیغہ مفرد رسم ہے۔ پریستاں[5] اصل لغت، مخفف اس کا پرستاں، پری استھاں تو ہم محض، مگر یہ بھی یاد رہے کہ آدم الشعرا رودگی (کذا) سے فخر المتاخرین شیخ علی حزیں تک کسی کے

کلام میں پریستاں یا پرستاں دیکھا نہیں۔

حضرت صاحب قبلہ کی جناب میں میرا اسلام عرض کیجیے اور کہیے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب کا مودت نامہ پہنچا۔ دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں۔ کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل جس کا عنوان سید فرزند احمد صاحب کے نام کا ہے ارسال کیا ہے۔ آپ بھی بہ نظر اصلاح مشاہدہ کیجیے گا۔ ہاں، پیرومرشد، فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں؟ بہ قول انشاء اللہ خاں ''یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے۔''

جناب سید فرزند احمد صاحب سے التماس ہے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہنچا کر حضرت شاہ عالم صاحب کو اور ان کے اخوان کو اور حضرت مقبول عالم کو میرا اسلام کہیے گا اور جناب چودھری عبدالغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمایئے گا کہ وہ اپنے عم نام دار اور استاد عالی مقدار کو میرا اسلام کہیں۔ زحمت تبلیغ سلام و پیام تقدیم خدمت اصلاح کا دست مزد ہے۔ والسلام، نجات کا طالب، غالب، یوم الخمیس ذی الحجہ و 12 مئی سال حال۔''

صفیر نے اپنے خط کے ساتھ جو کلام اصلاح کے لیے بھیجا تھا، اس میں غالب نے حسب ذیل ترمیم کی تھی۔

(1) خیال روئے توائے قبلہ نظر کردم زدیدنت نظرخویش بہرہ ور کردم

(2) بلند شد شب ہجراں چوشعلہ آہم چراغ ماہ خمش گشتہ بود بر کردم

شعر[6] میں غالب نے ''روئے توائے'' کی جگہ ''روئے ترا'' بنا دیا تھا، اور شعر[7] کے مصرع کو اس طرح بدل دیا تھا۔ ''چراغ مہ بہ فلک مردہ بود بر کردم''۔

صفیر نے مثنوی ابر گہر بار کے شکریے میں ایک فارسی مثنوی ''صبح امید'' غالب کو بھیجی، غالب نے اسے اصلاح سے مزین کیا اور خط ذیل صفیر کے نام لکھا:

''مخدوم زادہ مرتضوی دودماں سعادت و اقبال تواماں مولوی سید فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ میں نے استصلاح اشعار میں امتثال امر

کیا ہے تو اس واقعے کو یوں سمجھ لیا ہے کہ میں امیر المومنین کا بوڑھا غلام ہوں،
امیر نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ میرے سپرد کیا ہے (اور حکم دیا ہے)
کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر، ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں؟ (اپنے نانا
صاحب کی خدمت میں فقیر کی بندگی عرض کیجیے گا، اگر چہ حضرت میرے ہم عصر
ہیں، مگر ان کے ابو آبا کا غلام ہو کر سلام کیا لکھوں؟ مجھ کو ارادت میں ان سے
نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنوی نسبت میں
چاہیے۔نجات کا طالب۔غالب (یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ 1378ھ ہجری)"[8]۔

اصلاحات اشعار مثنوی صبح امید!

(1) صباحے کہ مست و بے اند اہل ہوش بدنبال او خور صبوحی بدوش
(2) چہ ابرے کہ از و بے شب زلف ماہ زصبح بنا گوش شد پردہ خواہ
(3) نویسد ہم او در ہماں مثنوی بہ ہنجار جادو بیان قوی

شعر ایک میں بدوش کی جگہ فروش، شعر دو میں کہ: ماہ کی جگہ کز وروز گیسو سیاہ، اور پردہ خواہ کی جگہ باج خواہ، اور شعر تین کا مصرع 2 اس طرح: زبانش پُر از منطق پہلوی۔

غالب کا تیسرا خط:

"نور چشم لخت جگر زبدۂ اولاد پیغمبر حضرت مولوی سید فرزند احمد
(صاحب) زاد مجدہٗ، اس درویش گوشہ نشیں کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستانِ
خیال کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت یہ آپ کا
احسان عظیم ہے۔ مجھ پر خصوصاً اور بالغ نظران ہند پر عموماً۔ (جناب میر
ولایت[8] علی صاحب سے بعد ارسال قیمت ومحصول، دو جلدیں مانگی ہیں۔ خدا
کرے وہ یہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقم تمہارے پاس بعد) غالب 8 ذی قعدہ
1281ھ ہجری۔"

چوتھا خط:

''بہ علاقۂ مہر و محبت نورِ چشم و سرورِ دل و بہ رعایت سیادت مخدوم و مطاع و مولوی سید فرزند احمد طال بقاؤہٗ و زادَ علاؤہٗ اس مصرع سے میرا مکنونِ ضمیر دریافت فرمائیں: بندہ شاہ[10] شمائیم وثنا خوانِ شما۔ (یارب، وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمائی سمجھتے ہیں؟ اصل فطرت[11] میں میرا ذہن تاریخ و معمار کے ملائم و مناسب نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں از راہ شوخی طبع گنتی کے عامیانہ معمے لکھے ہیں۔ وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود ہیں۔ تاریخیں اگر ہیں تو مادّے اوروں کے ہیں اور نظم فقیر کی ہے۔ یہ کلام نہ بہ طریق کسرِ نفس ہے، نہ بسبیل اغراق، سچ کہتا ہوں اور سچ لکھتا ہوں۔ اس نامۂ مہر افزا کو دیکھ کر مبادی پرستان خیال کی عبارت یاد آئی۔ افسوس ہے کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اس مسودے کی تسوید کے وقت تک آپ نے نہیں سنے تھے، ورنہ اس کے کیا معنی کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں؟ محمد رضا، برق کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے، حکایت ہے شکایت نہیں ......) پہلی جلد جس کا نام افق الخیال ہے اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو بے طلب بھیج دیں۔ اور معاً قیمت لکھ بھیجیں۔ (......) اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، سب اچھے ہیں مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں۔

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا　　ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

(کیوں حضرت؟ ابھی کچھ کی تحتانی[12] کا دبنا غیر فصیح نہیں؟ کچھ ابھی بات کر نہیں آتی، کیا اس کا نعم البدل نہیں؟)

درق ہیں جوششِ مضمون گریہ سے بادل　　بہ سان ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

درّ قائل:

کبھی ہوں گرم کبھی سرد، حسب موقع ووقت　　صفیرؔ آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ وموحدانہ مضمون اور بالغانہ الفاظ:

تم سلامت رہو قیامت تک　　صحت ولطفِ طبع روز افزوں

نجات کا طالب، غالب، شنبہ ذی القعدہ 1281ء ہجری۔''

پانچواں خط:

''نورچشم سرور دل فرزانہ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہ، اس نسبت عام سے کہ ہم اور آپ مومن ہیں سلام، اور اس نسبت خاص سے کہ آپ میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں، دعا۔ اور اس نسبت اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں، بندگی:

میں قائل خدا و نبی و امام ہوں　　بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بہ سبیل ایجاز لکھا جاتا ہے۔ دہائی خدا کی مجھے ولایت کی اپیل کی تاب نہیں۔ تم اپیلانٹ بنو، نہ مجھے رسپانڈنٹ بناؤ، لکھ بھیجو کہ صبح بہار کی عبارت فارسی ہے یا اردو اور ماکتب فیہ اس کا کیا ہے۔

(نجات کا طالب) غالب، چہار شنبہ ہفتم ذی الحجہ 1281ء ہجری۔

یہ پانچوں خط مرقع فیض[13] اور جلوہ خضر جلد تین دونوں میں ہیں، وہ عبارات جو صرف مرقع میں ہیں، قوسین کے اندر ہیں، اور وہ جو صرف جلوہ میں ہیں قلابین کے اندر ہیں۔ اس کے علاوہ اختلافات یہ ہیں: خط 3: مرقع: نور نظر، جلوہ نور چشم۔ خط 5: مرقع رسپاڈنٹ، جلوہ رسپانڈنٹ۔ مرقع چہارشنبہ، جلوہ چہار شنبہ، جلوہ میں کہیں کہیں خط میں عبارات کے بعد نقطے بھی ہیں۔ یہ بے کار ہیں یا ان سے یہ مراد ہے کہ ان کی جگہ جو الفاظ تھے وہ کسی وجہ سے درج نہیں ہوئے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ صفیر نے جلوہ صفحہ 227 میں لکھا ہے کہ ''جب تک حضرت غالب کے ہوش وحواس درست رہے خط وکتابت جاری رہی''۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے صفیر کی زندگی میں ان پانچ خطوں کے علاوہ کوئی خط شائع نہیں ہوا۔ ان کی وفات کے بہت بعد ان کے پوتے

جناب سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے طویل مقالے س، ش، ص میں جو ندیم گیا کے بہار نمبر (بابت 1925ء) میں چھپا تھا، دو خط درج کیے جن میں سے ایک کی نسبت ان کا بیان ہے کہ صفیر نے غالب کو لکھا تھا اور دوسرا ان کے دعوے کے مطابق غالب کی طرف سے اس کا جواب ہے۔ یہ دونوں خط ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

خط صفیر............ (کذا) ''ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخرالدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنؤ اور نانیہال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بہ عمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے اور مجھ سے تلمذ کیا اور قصہ مسمّٰی بہ سروشِ سخن جس کو ان کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا، چونکہ اس قصے کہ چھپنا چاہئے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے۔ اس لیے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے![14] اور طبیعت ان کی اچھی ہے، چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ اصلاح کو آئی ہے۔ اس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا، وہ یہ ہے:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

جواب غالب: ''مولوی سید فرزند احمد...... (کذا) اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ ستر واں برس مجھے جاتا ہے، ہائے۔

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

''نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا اور قصہ سروشِ سخن اس کے دوسرے دن پہنچا...... (کذا)۔ قصہ دیکھا، آپ کے جوہر[15] طبع کی لمعانی اور نیز فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کو سلانے کی کہانی ہے۔ مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر فسانہ عجائب کا مقابلہ کیا ہے

تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی۔...... (کذا) جا بجالا چار لکھا ہے...... (کذا) لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے...... (کذا) ہائے خدا کی مار کا تبان نانہجار پر، میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا...... (کذا) لو بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں، تمہارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک ان کو چپکا بٹھا رکھا اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں...... (کذا)''۔

جناب سید وصی احمد لکھتے ہیں کہ حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا:

بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس	سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب
خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس	مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دعا

میں نے نادر خطوط غالب کے تبصرے میں جو معاصر پٹنہ میں شائع ہوا تھا، موصوف سے دریافت کیا تھا کہ صفیر و غالب کے خط انہیں کہاں ملے، لیکن انھوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں خط میری رائے میں جعلی ہیں، اور جعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن صفیر کے شاگرد تھے۔ سخن کو اس سے انکار ہی نہیں تھا، وہ اس کے مدعی تھے کہ خود صفیر کو ان سے تلمذ ہے (تنبیہ صفیر بلگرامی صفحہ 88)۔ اس موقع پر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ صفیر و سخن میں سے کس کا دعویٰ صحیح ہے، اور خطوط زیر بحث کو جعلی قرار دینے کی وجہ بیان کرنے پر قناعت کروں گا۔ صفیر کے خط میں دہلی جانے اور وہاں غالب سے سخن کے متعلق گفتگو آنے کا ذکر ہے۔ صفیر اوائل 1282ھ میں دہلی گئے ہیں۔ (جلوہ ا، صفحہ 222) اور وہاں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے ہیں (جلوہ 2، صفحہ 229)، اس سے لازم آتا ہے کہ خط دہلی سے واپسی کے بعد کا ہو، غالب کے خط میں جوان کی عمر کا ذکر ہے، اس سے اس کا زمانہ تحریر 1282ھ ثابت ہوتا ہے، لیکن سروشِ سخن (قطعات تاریخ طبع اور تاریخ دتا سی جلد 2 صفحہ 171)، 1281ھ ہی میں لکھنؤ کے مطبع نول کشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہوں۔ جعل کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروشِ سخن طبع اول کے سال انطباع سے ناواقف ہے اور اس بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں۔

یہ مستبعد ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں۔

غالب نے صفیر کے رسالہ تذکیر و تانیث کے لیے ایک دیباچہ لکھا تھا جو عود ہندی اور اس رسالے کی اشاعت میں موجود ہے۔ صفیر جلوہ 224 میں اسے تقریظ کہتے ہیں اور اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ میرے دوران قیام دہلی میں غالب نے رسالہ دیکھا، بہت تعریف کی اور تقریظ لکھ کر دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریظ دیباچہ اوائل 82ھ میں حوالہ قلم ہوا، لیکن علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں غالب کا ایک خط جس کے مکتوب الیہ صاحب مارہروی ہیں، شائع ہوا ہے۔ اس میں مرقوم ہے کہ ''دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا، مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ...... مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں'' صفحہ 97۔ یہ خط 26/اگست 1866ء کا لکھا ہوا ہے جو ربیع الثانی 1283ھ کے مطابق پڑتی ہے۔

حواشی

1ے جلوہ 3، صفحہ 229۔ 2 صفیر کے فارسی خط میں ہے امر ابمعرض پابوسی بزرگان بسر در آورد'' جلوہ 3 صفحہ 236۔ 3 شور سودا از سر برانگیختہ'' جلوہ 2 صفحہ 227۔ 4 نالہ ہائے چند کہ از دل ضم پیوند سر زدہ اند'' جلوہ 3، صفحہ 227۔

2ے یہ صفیر کے خط کا جواب ہے۔

3ے یہ سنہ صریحاً غلط ہے، مراسلت کا آغاز 1280ھ میں ہوا ہے۔ اگر یہ خط 1280ھ کا سمجھا جائے جو قرینِ قیاس ہے تو تاریخ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ پہلا خط ذی الحجہ کی دسویں کو مارہرہ پہنچا تھا۔ یہ دوسرا ہے:

4ے سرولایت علی اس مطبع کے منتظم تھے جس میں بوستان خیال کا ترجمہ طبع ہوا تھا ان کے نام کا ایک خط میں نے رشحاتِ صفیر سے لے کر آثار غالب میں درج کیا ہے۔ اس کا لفافہ اب تک کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں موجود ہے۔

5ے یہ مصرع حافظ کا ہے۔

6ے اس کے متعلق صفیر نے حاشیے میں لکھا ہے: بندہ صفیر نے حضرت غالب کو لکھا تھا کہ پٹنہ

کے لوگ آپ کے معما اور چیستان کے مشتاق ہیں کہ ان لوگوں نے آپ کو معمے میں کامل سنا ہے...... ''غالب کے معمے کلیات کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں لیکن قلمی نسخوں میں ہیں جن سے تین معمے لے کر میں نے مآثر غالب میں درج کیے ہیں۔ 3 ی کے دبنے کے متعلق شعرائے ایران و ہند کے مسلک کا حال راقم کے مضمون نکات سخن سے معلوم ہوگا، جو اردو ادب کے حسرت نمبر میں شائع ہوا ہے۔ خود غالب کے اشعار فارسی و اردو میں ی بکثرت دبتی ہے:

نیست در رہروی از سایہ وسر چشمہ گریز　　خامہ رہرو بود و سایہ وسر چشمہ دعاست

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال　　ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مرقع فیض جس میں صفیر اور ان کے تلامذہ کے تراجم اور منتخب اشعار ہیں۔ 1295ھ میں طبع ہوا تھا اور اس کے سرورق پر نواب سید تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا المتخلص بہ سلطان شاگرد صفیر کا نام مصنف کی حیثیت سے درج تھا۔ لیکن تنبیہ صفیر بلگرامی میں جو مرقع کا رد ہے سلطان کا ایک خط شامل ہے جس کے مکتوب الیہ ان کے والد ہیں۔ اس خط سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کتاب سلطان نے نہیں لکھی۔ میر صفیر صاحب بلا اطلاع غلام کہ ہرگز وحاشا فدوی ازاں مطلع نیستم از تصنیف خود با دیگرے از شاگرد خود بنام غلام طبع نمود، نزد غلام مع چند نسخہ مرقع فیض آمدہ گفتد کہ آنچہ نوشتہ ام آنرا قبول نمایند۔ بندہ عرض کردم باعث بدنامی وتوہین من خواہد شد، چرا کہ کلام دیگر منسوب بخود نمایم بے حیائیست ویک نسخہ ہم ازاں باوجود اصرار شاں ہرگز نزد خود نداشتم'' صفحہ 127۔ تنبیہ صفیر بلگرامی ایک شخص سردار مرزا متخلص بہ آزاد کی طرف منسوب ہے۔ جناب سید وصی احمد بلگرامی نے س ش ص میں لکھا ہے کہ '' جناب سخن نے...... لکھی اور ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے شائع کی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ خود سخن اس کے مصنف ہیں، لیکن سردار مرزا ایک فرضی شخص نہیں، یہ سخن کے دوستوں میں تھے اور ان کا نام دیوان شخص میں آیا ہے۔ جلوہ خضر صفیر کی تصنیف ہے۔ جلد ا، ان کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی، جلد 3 کا حصہ 1 زیر طبع تھا کہ صفیر کا انتقال ہوگیا۔ اس کا حصہ 3 لکھا گیا تھا یا نہیں۔ اس کی خبر نہیں۔

8. سروشِ سخن فسانہ عجائب کے جواب میں لکھا گیا تھا اور اس میں سرور پر اعتراض کیے گئے۔
9. سخن نے غالب کی زندگی ہی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ غالب میرے نانا ہوتے ہیں اور میں ان کا شاگرد ہوں۔ تنبیہہ صفیر بلگرامی میں ہے کہ سنبھالا، الخ، سخن نے دہلی ہی میں کہا تھا اور غالب نے اسے سن کر انہیں گلے لگالیا تھا۔ اور آب دیدہ ہو کر کہا تھا، میری جان، ایسا شعر نہ کہا کرو، ابھی تو ہم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا دنیا میں کیا دیکھا بھالا، دیکھو عارف ایسے ہی لختِ جگر اگل کر دنیا سے ناشاد گیا۔ تم بھی زندگی سے بیزار ہو۔ الغرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی کہ خبردار، اب جو سنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سید، تیری جان اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا۔ صفحہ 82۔
10. اس سے یہ ثابت کرنا مدنظر ہے کہ کتاب صفیر کی لکھی ہوئی ہے۔

(سال نامہ آج کل دہلی، اگست 52ء)

مختار الدین احمد

غالب کے تین غیر مطبوعہ خطوط

والیانِ رام پور، اور وہاں کے دوسرے اصحاب کے نام جو خطوط ''مکاتیب غالب'' میں شائع ہوئے ہیں، ان کی تعداد ایک سوتیس ہے۔اس کے فاضل مرتب فرماتے ہیں۔''نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے فرامین کے مسودوں نیز مرزا صاحب کے زیر نظر مکاتیب میں تقریباً 135 ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں جو مثلوں میں موجود نہیں، یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے تو مکاتیب غالب کی تعداد 364 ہوتی جو اور بڑھ جاتی اگر ان کی اہل شہر میں خط و کتابت بھی دستیاب ہوتی''۔

مرزا کے مکاتیب رام پور، ایک لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ان خطوط سے ان کی سیرت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔رام پور کے اور سارے گم شدہ مکتوبات مل جائیں تو ان کی شخصیت کی اور بھی واضح تصویر ہمارے سامنے آجائے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے پہلو بھی پیش نظر ہو جائیں جن سے ہم اب تک ناآشنا ہیں۔

آج کی صحبت میں مرزا کے تین غیر مطبوعہ خطوط اپنے مکرم امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے شکریے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، جنہوں نے ہمیں یہ خطوط علی گڑھ میگزین ''غالب نمبر'' کی طبع ثانی کے لیے عنایت فرمائے ہیں۔ یہ خطوط ''مکاتیب غالب'' کی کسی اشاعت میں یا کسی اور جگہ اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں اور پہلی بار ناظرین ''آجکل'' کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

تینوں خطوط کے مکتوب الیہ نواب کلب علی خاں والیِ رام پور (1835-1887م) ہیں جو علی

الترتیب 1866ء، 1867ء، 1868ء میں سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ پہلے ذیل میں ان مکاتیب کا متن پیش کیا جاتا ہے۔

(1)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ ورودِ توقیع ونویدِ عفو نے رواں پروری کے سو روپے بابت تنخواہ اکتوبر 1866ء از روئے ہنڈوی ملفوفہ معرض وصول میں آئے۔ یا امیر المسلمین حضرت کا عزم رونق فزائے اکبرآباد سن کر چاہا کہ وہاں آؤں۔ ریل کی سواری کی تاب ہرگز نہ پائی۔ منزل بہ منزل جانے میں سوچا کہ آگرہ سات منزل، رام پور چھ منزل، یہاں جو جاؤں وہیں کیوں نہ جاؤں۔ عزم مصمم کیا کہ اپنے فرزند اور آپ کے غلام کو بھیجوں۔ وہ بھی خوش خوش آمادۂ رہ روی ہوا۔ ناگاہ تپ محرقہ نے اسے گھیرا اور شانے کا درد علاوہ۔ مہینہ بھر ہوا کہ نہ تپ اترتی ہے نہ شانے کا درد جاتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز سے فصد بھی کھلی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کسی شب کو کچھ سو رہتا ہے ورنہ ساری رات جاگتا اور ہائے ہائے کرتا ہے۔ اس کے ساتھ سب جاگتے ہیں۔

راحتے نیست دراں خانہ کہ بیماری ہست

مجمل یہ ہے اور مکرمی میر محمد زکی صاحب عرض کریں گے، زیادہ حد آداب:

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عریضہ اسد اللہ خاں بے دست گاہ

معروضہ دوشنبہ پنجم 5 نومبر 1866ء

(2)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل حضرت کے اقبال سے ایک مسرت تازہ مجھ کو پہنچی، تفصیل اس کی یہ کہ اقبال نشاں مرزا شہاب الدین خاں، انگریزی خواں ہے۔ اخبار انگریزی دیکھا کرتا ہے، اس

نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے انگریزی اخبار میں دیکھا کہ جناب نواب صاحب قبلہ جو شریک اجلاس کونسل ہوئے، نواب گورنر جنرل بہادر مع اور کونسل نشینوں کے نواب صاحب کے حسن صورت وفرطِ خلق ولطفِ تقریر سے بہت راضی وخوشنود ہوئے اوران کی رائے سب کو پسند آئی:

ایں مراتب کہ دیدۂ جزویست　　کارِ کلّی ہنوز در قدرست

روز افزونیِ دولت و اقبال کے مدارج ابھی بہت سنوں گا اور دیکھوں گا۔ ان شاء اللہ العلی العظیم۔

تم سلامت رہو قیامت تک　　دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

دوام دولت کا طالب۔ غالب

26 رجنوری 1867ء

(3)

حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت سلام!

بعد تسلیم معروض ہے، آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پان سو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا، جیسا کہ مرزا جلال اسیر کہتا ہے۔

جرعۂ لطفِ تو بعد از ما بہ ما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے، خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے، اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں، امین الرحمٰن اس کا بھانجہ ہے۔ مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ اخیر عمر میں تین التماسیں ہیں آپ[1] سے، ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری التماس یہ ہے کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینہ جو

---

1. اصل: ہے

مجھے ملتا ہے، اس کے نام پر اس کی حین حیات قرار پائے۔ یہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو قیامت تک　　　دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

روز شنبہ 5/ربیع الثانی و 27/جولائی سال حال [1]

عرضداشت دولت خواہ اسد اللہ

اب ان خطوط کے متعلق بعض قابل ذکر باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

خط نمبر (1):۔ اس خط کو مکاتیب غالب میں شامل کر لیا جائے تو اس کا نمبر 77 اور اس کی جگہ خطوط مورخہ 16/اکتوبر 1866ء اور 18/نومبر 1866ء کے درمیان ہوگی۔ گو راقم کا قیاس ہے کہ خط مورخہ 16/اکتوبر اور اس خط کے رمیان کم از کم مرزا نے ایک خط اور ضرور لکھا ہوگا۔ خط نمبر 76 میں مرزا نے نواب صاحب کو اپنی فارسی دانی اور دوسرے فرہنگ نویسوں کے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھی تھیں [2] جن میں وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور لکھ بھیجا۔

''پس اگر آن مشفق را ہم چنیں منظور باشد و اشارتے سازند کہ واسطۂ ترسیل رسائل از فیما بین برداشتہ شود، ورنہ بنان خامہ را بہ امور خارج المجث تکلیف نہ دادہ باشند [3]''

مرزا بے چارے، بہت گھبرائے اور فوراً ایک معذرت نامہ لکھ بھیجا۔ ''توقیع وقیع آیا، پڑھتے ہی کانپ اٹھا اور عالم نظر میں تیرہ و تار آ گیا۔'' پھر آخر میں لکھا۔ ''گناہ معاف کیجیے اور نویدِ عفو میں مجھ کو تقویت دیجیے۔'' کلب علی خاں صاحب نے ان کی معذرت قبول کی۔ گو ان کی طبیعت کا تکدر غالباً کلیۃً دور نہیں ہوا [4]۔

مرزا کے معذرت نامہ مورخہ 16/اکتوبر اور اس خط مورخہ 5/نومبر کے درمیان میں جو آپ کے پیش نظر ہے، قیاس چاہتا ہے کہ مرزا نے کم از کم ایک خط ضرور لکھا ہوگا جس میں ان کی معذرت قبول کرنے کا شکریہ ادا کیا ہوگا۔

---

1. 1868ء　　2. 1868ء　　3. مکتوب 77

4. اس لیے کہ اس کے بعد پھر اور کوئی نثر انھوں نے مرزا کے پاس اصلاح کے لیے نہیں بھیجی۔

مرزا غالب کی تحریر کے علامات اوقاف سے جو اصحاب واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک سو کی رقم کو ماعتم لکھا کرتے تھے۔ اسے وہ محفوظ طریقۂ تحریر سمجھتے ہوں گے۔ اس کا ان کے یہاں التزام نظر آتا ہے لیکن یہاں ان کا عمل ان کے طریقۂ کار کے خلاف ہے، گو اس عمل کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں[1]۔ نومبر 66ء میں آگرے میں گورنر جنرل کا دربار تھا جس میں والیانِ ریاست اور رئیسان نامی بھی شریک تھے۔ نواب صاحب بھی مدعو تھے لیکن ناسازیِ طبع کے باعث راستے ہی سے لوٹ آئے اور آگرہ نہ پہنچ سکے۔

'غلام' سے مراد عارف کے دونوں لڑکوں کامل علی خاں اور حسین علی خاں میں سے کوئی ایک ہے، اس زمانہ میں حسین علی خاں کے لیے مرزا کو روپوں کی ضرورت تھی اور متعدد خطوں میں نواب صاحب کو بھی اس کی طرف متوجہ کر چکے تھے، اس لیے قیاس ہے کہ ان کا ارادہ نواب کی خدمت میں حسین علی خاں ہی کو بھیجنے کا ہوگا۔ مزید اطلاع کے لیے 1866ء کے سارے خطوط مندرجہ 'خطوط غالب' دیکھیے لیکن ''خان برادران'' کی اس علامت کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

خط نمبر (2):۔ نواب کلب علی خاں کو لارڈ لارنس گورنر جنرل نے لیجس لیٹو کانسل کا ممبر بنایا تھا جس کے جلسے کلکتے میں ہوا کرتے تھے، نواب صاحب وہاں گئے بھی لیکن ناسازیِ طبع کے باعث ایک ماہ بھی نہ ٹھہر سکے اور 21 رجنوری 67ء کو رام پور واپس آگئے۔

خط نمبر (3):۔ یہ خط 1868ء کا لکھا ہوا ہے، نواب مرزا خاں، داغ کا نام ہے جن سے مرزا کے تعلقات بہت اچھے تھے اور جنہیں وہ اکثر اپنی ضرورتوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مرزا ذہنی انتشار کے کس دور سے گزر رہے تھے اور یہ کہ مصائب کی گرفت ان پر اس قدر مضبوط تھی کہ اپنی ضرورت پیش کرنے اور مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ جادۂ خلوص و محبت سے بھی بہک جاتے تھے ورنہ ان کے قلم سے اپنے مخلص دوست مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی موت کے بعد ان کی بیوہ کے خلاف وہ جملے نہ نکل سکتے جو انھوں نے سپردِ قلم کیے ہیں۔ انہیں اپنی ضرورتوں کے پیش کرنے کا تو پورا اختیار تھا لیکن یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ وہ دوسروں کی ضرورتوں کو کم تر اور ہیچ گردانیں۔ یہ نشان (عــۃ) دراصل

---

1. مکاتیب نمبر 40,41,42,48

بیاض کا مخفف ہے، خط یا پیراگراف کے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے۔

مرزا نے ابتدا میں بڑی خوش فہمی سے کام لیا تھا، اگست میں نواب صاحب کو لکھتے ہیں۔

''تین التماسیں سابق (میں) پیش ہوئی تھیں سو اب پہلے مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر مظفر حسین خاں کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ ان شاء اللہ...... نومبر دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی[1]...... لیکن تین ہی چار ماہ میں یہ حالت ہوئی کہ وہ انتظار کرتے کرتے ایسے عاجز آئے کہ تین التماسوں میں سے دو سے دستبردار ہو گئے۔ وہ 16/نومبر کے خط میں لکھتے ہیں......

''ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی، اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال؟ کبھی نہ کہوں گا...... شادی کیسی! میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے......[2]''

مرزا اپنے قول کے پابند رہے اور مرتے دم تک اس عہد کو نباہتے رہے اور پھر کبھی ان دونوں امور کے متعلق انہوں نے رامپور کچھ نہ لکھا اور یوں ان کی زندگی میں نہ کسی لڑکے کی تنخواہ مقرر ہوئی، نہ حسین علی خاں کی شادی کے لیے کوئی مدد ملی اور نہ ان کا قرض ہی ان کے سامنے ادا ہو سکا، اور یہ ساری حسرتیں ساتھ لے کر وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

مرزا کی تینوں التماسوں کا حسرت ناک انجام آپ دیکھ چکے۔ جہاں تک لڑکوں کی تنخواہ کا تعلق ہے، مرزا کے عریضہ مورخہ 11/نومبر 1861ء جس میں انہوں نے اپنی بیماری کے پیش نظر درخواست کی تھی کہ میرے بیٹے (غالباً باقر علی خاں) کے لیے تنخواہ مقرر کر دی جائے[3] نواب صاحب صاف لکھ چکے تھے۔

''ہر چند مخلص را پرورش و مراعات صاحب زادہ آن کرم فرما بدل ملحوظ و مرکوز لاکن دستور ایں سرکار بہ عنوان مرقومہ سامی نہ بودہ است[4]۔''

---

1. مکاتیب رقم 111
2. مکاتیب رقم 115
3. دیباچہ 8 مرزا کا یہ خط مثل میں محفوظ نہیں
4. دیباچہ 9

مرزا کے انتقال کے بعد حسین علی خاں کو پچیس روپے ماہوار کی ملازمت رامپور میں مل گئی۔
گوان کی شادی کے موقعٔ پر کوئی مدد کی گئی ہو اس کا پتہ نہیں چلتا، جہاں تک ادائیگی قرض کا تعلق ہے، امراؤ بیگم کے بار بار گڑگڑانے اور لکھنے پر کہ مرزا صاحب کے قرض (مبلغ 800) کی ادائیگی کا سامان کیا جائے اور یہ کہ میں اب نان شبینہ کو محتاج ہوں۔ رحم فرمایئے اور خبر گیری کیجیے[1] ......اب قرض بھی نہیں ملتا، نوبت فاقہ کشی کی پہنچی[2]۔ اتنا ضرور ہوا کہ 600 کی رقم مرزا کا قرض ادا کرنے کے لیے عطا کی گئی[3]۔ اس کے علاوہ انہیں جو نان شبینہ کی محتاج تھیں اور جنہوں نے نواب صاحب کو رحم فرمانے اور اپنی خبر گیری کے لیے لکھا تھا۔ مرتے دم تک ایک حبہ بھی نہ پا سکیں۔

مرزا غالب کے یہ تینوں خطوط بہت اہم ہیں اور ان سے کاتب سے زیادہ مکتوب الیہ کی سیرت اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

(آجکل، دہلی، مئی 1952ء)

1۔ دیباچہ 5   2۔ دیباچہ 5   3۔ دیباچہ 127،

1883ء کے دو خط متعلق بہ غالب

جناب محمد اسمٰعیل صاحب مہر آروی فسانہ غمناک میں رقمطراز ہیں:

''میر سید خورشید علی بلگرامی خورشید [1307ھ] مورث اعلیٰ جناب صفیر بلگرامی حنفی المذہب تھے۔ بعد ان کے سید افتخار علی بلگرامی و سید محمد عسکری بلگرامی و سید بہادر علی بلگرامی و سید بندہ علی بلگرامی پسران میر سید خورشید علی بلگرامی نے مذہب اہل تشیع اختیار کیا اور اب الام ان کے حضرت مولوی سید صاحب عالم بلگرامی صاحب ولد حضرت سید شاہ مخدوم عالم بلگرامی خلف جناب سید شاہ مقبول عالم بلگرامی ولد جناب سید شاہ نجات اللہ پسر دوم جناب حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب بلگرامی ثم مارہرہ الملقب بہ صاحب البرکات سجادہ نشینِ سجادہ مارہرہ غفرانہم۔

حضرت صفیر بلگرامی منجانب الاب والام حسینی الحسنی نسلاً و واسطی اصلاً بلگرامی وطن، قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد مسکن تھے۔ آپ کی ولادت بتاریخ 27/ ذی القعدہ 1249ھ اپنے نانہال میں بقام مارہرہ ضلع ایٹہ باعتبار کلکٹری و ضلع مین پورہ باعتبار عدالت محلّہ بستی درگاہ حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب الملقب بہ صاحب البرکات قدس سرہٗ، سرکار خورد میں خلعت میلاد پہنا اور نام تاریخی آپ کا شمس الضحیٰ رکھا گیا۔ پانچ برس کی عمر میں (مگر بقول جناب سید محمد حسن امیر صاحب چار برس کی عمر میں) 1249ھ بمعیت بزرگان اپنے قصبہ مارہرہ و

بلگرام کی سیر کرتے ہوئے وارد مقام آرہ ہوئے اور تحصیل علوم میں کوشش
شروع کی۔ تیرہ برس تک سوائے تحصیل علوم کے کسی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ بعد
تحصیل علوم ضروری پھر آمد و رفت بلگرام، لکھنؤ، مارہرہ، دہلی، فرخ آباد و کانپور
وغیرہ وغیرہ کی متواتر و متوالی رہی اور 1890ء تک اسی روش سے سیر دیار و امصار
محض بہ نظر تفریح طبع کرتے رہے۔''

(فسانہ غمناک غیر مطبوعہ)

سید فرزند احمد نام، صفیر تخلص تھا۔ مرزا غالب اور مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی
و فارسی آرہ و مارہرہ میں حاصل کی، ادبی ذوق غیر شعوری طور پر خاندان سے ورثے میں پایا تھا۔ مگر
ابتداء سے شعر و سخن کا ذوق نہ تھا۔ چودھویں برس یعنی 1264ھ میں بغیر کسی کی تحریک کے طبیعت
میں موزونی پیدا ہوئی اور دو غزلیں اپنی زمین میں نظم کیں۔

صفیر بلگرامی نے پے در پے سات تخلص تبدیل کیے۔ آثم، اثیم، صبا، نالاں، احقر اور صفیر۔
قطب سب سے اول، صفیر آخر میں رکھا جو زندگی کے آخر لمحات تک ہم نوائی کرتا رہا۔ گمان ہے قطب
اپنے نانا صاحب کے ماحول سے، جو صوفی اور بڑے پایہ کے ولی و بزرگ تھے، متاثر ہو کر رکھا ہو۔

صفیر بلگرامی کی ولادت ''شمس الضحیٰ'' (1249ھ) اور وفات شہر رمضان المبارک (1307ھ) کے تاریخی ناموں
میں مضمر ہے۔ آپ کی تالیف مطبوع[1] اور غیر مطبوع سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔

آج کی صحبت میں دو غیر مطبوع خط ہدیۂ ناظرین کرنے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہوتا
ہے کہ غالب کے فارسی کلام اور اردو کلام کے متعلق اہل فن اس دور میں کیا نظر رکھتے تھے بلکہ آزاد
کے پیش کردہ واقعات کو جن نگاہوں نے تعصب کی عینکوں سے دیکھا ہے اور غلط استدلال سے
آزاد پر حرف گیری کی ہے، وہ ان خطوط کی روشنی میں آزاد کو حق بجانب سمجھنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

خط سید بندہ رضا بلگرامی آرزو۔ محلہ ملکھنڈ بلگرام

---

1. راقم نے جناب صفیر بلگرامی کی جملہ تصنیفات کی ایک مکمل فہرست 1956ء کے آج کل میں عکس
زیارت کے عنوان سے شائع کر دی ہے۔

جناب صفیر تسلیم (مزاج شریف، بندگی حضرت بندگی۔آپ کی دعا سے، اس جملہ مہملہ کو یوں معنی پہناتا ہوں کہ آپ تو اس عریضہ اور اس تسلیم کا اور مزاج شریف کا جواب دیں گے نہیں، لہذا بمصداق۔

از من بمن سلام وہم از من بمن پیام

رنجِ دلی مباد پیام وسلام را

خود ہی سلام کہا اور خود ہی جواب بھی دے لیا۔خود ہی مزاج پوچھا، خود ہی دعا کہہ لی۔آج دوپہر کا وقت، دھوپ کی شدت، گرمی کا تراقہ، لون کا زور شور) بیٹھے بیٹھے جی جو گھبرایا، رشحات صفیر دیکھنے لگا۔اس کتاب کا کیا کہنا۔اگر چہ کلیتًا تانیث تذکیر کے قواعد کا انضباط بہت دشوار ہے، تاہم آپ نے خوب ہی قواعد منضبط فرمائے۔مگر ساتھ ہی اس کے ایک بہت رستخیز یہ کردیا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔

اور اسی طرح یہ کہ طپش میرٹھی کو بھی مستند ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ خود آپ اختلاف دہلی اور لکھنؤ کے قائل ہوئے ہیں۔(دیکھیے صفحہ 145، رشحات صفیر)، درحالیکہ اختلاف مابین دہلی ولکھنؤ مسلّم ٹھہرا تو مقلدین لکھنؤ کو مجرد دلی والوں کی تانیث وتذکیر پر بھروسہ کرنا کب روا ٹھہرا۔مگر کیا کیجیے۔حب الشیٔ......آپ کو اور جناب قدر[1] کو مرزا غالب صاحب کی محبت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے کہ جیسا قوم نصیری کو حب علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے۔ حالانکہ میرا یہی اعتقاد ہے کہ مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہل ہند سے بہتر ہیں مگر اردو میں تو ایک مبتدی لکھنوی کے مقابل نہیں۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائی تنہائی نہ پوچھ

ملاحظہ وانصاف طلب ہے۔اگر نقص اس کتاب میں ہے تو یہی ہے۔

مجکو یہ بھی آپ کے اور جناب قدر کی طرف سے احتمال ہے، عجب نہیں

1۔ جناب سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی اور جناب غلام حسین قدر بلگرامی، دونوں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایہ سے داخل کر دیے جائیں۔ میری اس رائے ناقص سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں مرزا غالب صاحب کا غیر معتقد ہوں۔مگر بمقابلہ لکھنؤ، دلّی والوں کو میں ضرور ناقص سمجھتا ہوں۔اس میں کوئی ہوں، دوسرے یہ کہ اسیر کی نسبت جو آپ نے اپنا اعتقاد بہت کچھ ظاہر کیا ہے، کیا میاں بحر صاحب سے کچھ اچھے تھے؟ امیٹھی میں نہیں رہتے تھے۔بڑے غضب کی بات ہے کہ ناسخ طبقہ سوم میں معلم ثالث کہلائیں، اور آتش جو طرز عاشقانہ میں فرد تھے، صرف ناسخ کے شریک مشاعرہ لکھے جائیں اور اس پر آپ اعتقاد لائیں۔

آرزو عفی عنہ

18/مئی 1883ء

اس خط کے چند جملے غور طلب ہیں۔

1۔ مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہل ہند سے بہتر ہیں مگر اردو میں ایک مبتدی لکھنوی کے مقابل نہیں۔

2۔ عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرایے سے داخل کر دئے جائیں۔

3۔ بمقابلہ لکھنؤ، دلّی والوں کو میں ضرور ناقص سمجھتا ہوں۔اس میں کوئی ہوں۔

4۔ ناسخ طبقہ سوم میں معلم ثالث کہلائیں اور آتش......صرف ناسخ کے شریک مشاعرہ لکھے جائیں۔

آزاد نے آب حیات میں اس دور کے عوام وخواص کی رائے کو غالب کے سلسلے میں پیش کیا تو تمام محققین نے آزاد کو مطعون قرار دے دیا کہ اپنے استاد ذوق کی مدح کے سبب غالب کی تنقیص کی گئی۔لیکن غالب کی موت کے بعد 1883ء کا یہ خط شاہد ہے کہ غالب کی فارسی دانی کے سبب ان کے اردو کلام کو ناپسند قرار دیا جاتا تھا، مگر غالب کے مداحین اس وقت کیا تصورات رکھتے

تھے، اس خط کے جواب میں ملاحظہ فرمائیے۔

خط سید فرزند احمد بلگرامی صفیر
پھاٹک میر صاحب، آرہ

محترم، تسلیم

میری تحریر جو اساتذہ کے باب میں ہے، یا ایسی ایسی باتوں میں جو میری رائے ہے، نہ ابھی آپ نے دیکھی نہ سنی۔ میں اپنے ہوش کے وقت سے کبھی ایسے کا شاگرد نہیں ہوا جس کو سمجھ نہ لیا ہو۔ محبت اور چیز ہے اور سمجھ اور چیز ہے۔ سنیے، میں نے جو غالب کو سمجھا ہے، حقاً اور ایماناً بیان کرتا ہوں۔ علم عربی میں تو ان کو محض نا آشنا جانتا ہوں۔ مگر بزور فارسی ان میں ضروری[1] واقفیت کا قائل ہوں۔ فارسی میں ان سے بڑھ کر کسی شاعر ہند کو فارسی گو نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ سنیے، ہندوستان میں یہی نامی شاعر ہوئے ہیں۔

1۔ خسرو، 2۔ بیدل، 3۔ آرزو، 4۔ قتیل، 5۔ مظہر جانجانان، 6۔ فقیر، 7۔ حسن، 8۔ غالب۔

ان کے سوا غنی کشمیری تھے۔ واقف لاہوری تھے۔ علی سرہندی تھے اور فیضی...... شاعر خاص ہندوستانی تھے۔ ان میں سے خسرو، فقیر، حسن ایک پایہ کے، اور آرزو، قتیل ایک سرمایہ کے، اور بیدل، مظہر، غالب ایک پایہ کے ہیں۔ مگر خسرو اور حسن دہلوی اس وضع کے شاعر تھے جو وضع سعدی کے پہلے تھی۔ جس کو ابوالفضل نے متروک اور ناپسند لکھا ہے۔ وہ لوگ عرفان آب تھے، شاعر نہ تھے۔ بلند نام اور عالی مقام تھے۔ شاعر نہ تھے[2]۔

آرزو، قتیل...... نہ الا الذی، نہ الّا الذی...... مگر ان کی معلومات کا قائل ہوں، نہ ان کے

---

1. ضروری میری دانست میں لازمی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔
2. خط کے حاشیہ پر ''مثلاً مولانا روم'' تحریر ہے۔

مذاقِ شاعری کا۔ بیدل، مظہر، غالب یہ تینوں بہادران میدان سخن تھے۔ بیدل اور مظہر نے مضامین عارفانہ کو مذاق شاعرانہ سے ملا کر جیسا کہا ہے، دل لوٹا جاتا ہے۔ اللہ در من قائل۔

چو سرشک نے بے سروپا ئیم قدمے نزد بہوائی تو
کہ ہزار آبلہ درعرق بگداختم زحیائی تو
نہ بدل زعجز رسارسم ، نہ برمز آئینہ وارسم
بکجا رسم کہ بجا رسم من بیدل از ہمہ جای تو
نفس آشفتہ می دارد چو گل جمعیت (ما)[1] را
پریشاں می نویسد کلک موج احوال دریارا
اے زشوخی ہائے حسنت محو پیچ وتاب ہا
حیرت اندر آئینہ چوں موج در گردابہا

نظم تو نظم، نثر بھی ایسی کہ دل پذیر بلکہ دل گیر، بیان کی وسعت ظہوری کی قدرت یاد دلاتی ہے۔ بھلا ظہوری نے تو نو رنگوں کو مدنظر رکھا تھا اور نورس کو بیان کیا تھا جس میں ہزار ہا رنگ مل سکتے ہیں۔ بیدل تو نیرنگی کے بیان میں اور یک رنگی کے میدان میں چلا جاتا ہے، جس کا حد نہ کنار، نہ آغاز نہ انجام، واہ واہ سبحان اللہ، وسعت بیاں ہو تو ایسی ہو۔ مجھے فیضی فیاضی اور بیدل اس بات میں ایک ہی جوڑ کے معلوم ہوتے ہیں۔

مظہر جانجاناں کا دیوان اس وقت پیش نظر نہیں۔ مگر ان کی بھی شستگی اور رفتگی اور سلیقہ اور شاعری کچھ کم نہیں۔ چند شعر مثنوی کے یاد ہیں۔

خدا در انتظار حمد مانیست　　محمد چشم براہ ثنا نیست
خدا مدحت طراز مصطفیٰ بس　　محمد حامدِ حمدِ خدا بس
محمد از تو می خواہم خدارا　　خدا یا از تو حق مصطفیٰ را

غالب جنت آرام گاہ کہ خاتم الشعرائی فرس ہندوستان میں ہوئے ہیں، ان کی درخشانی طبع نے آخر زمانہ میں ہندوستان کا نام روشن کر دیا۔ کلام فارسی ان کا مشہور اور زبانوں پر مذکور ہے۔

---

1. اصل خط میں 'ما' لکھنے سے رہ گیا ہے، اس لیے قوسین میں لکھا گیا۔

چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں۔

اے زساز زنجیرم درجنوں نواگر کن — بند گر بدین ذوق ست پارہ گراں تر کن

جنوں مستم بہ فصل نو بہارم می تواں کشتن — صراحی در کف وگل در کنارم می تواں کشتن

بجرم ایں کہ درمستی بپایاں بردہ ام عمرے — بکوئی میفروشان درخمارم می تواں کشتن

بہ ہجراں زیستن کفراست، خونم رادیت نبود — چراغ صبح گاہم آشکارم میں تواں کشتن

حشرست، وخدا داور، دہنگامہ بپایاں — اے شکوۂ بے مہریٔ احباب کجائی

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم — تابا تو خوش نشینم ونظارہ ہم کنم

یہ حقیقت شعرائے فارسی گو ہندوستان کی تھی، اب ان لوگوں میں سے سب نے اردو شعر کہے ہیں۔ مگر وہ ابتدا تھی تفریحاً اور تفنناً کہنے کا اتفاق ہوا۔ اور غالب کہ آخر میں ہوئے، انھوں نے زمرہ شعرائے اردو میں گنجائش کی اور اردو شاعری بطرز خاص کی۔ اور طرز خاص کی وجہ وہی ہوئی جو ناسخ کا کلام دیکھ کر اہل دہلی کے لیے واقع ہوئی۔ مگر سب میں غالب نے جو طرز بیان ایجاد کی بہ نسبت اوروں کے سہل اور صاف ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فارسی ترکیب کے شعر کہے اور اس میں فعل وحرف اشارہ فقط ہندی رکھے۔ جیسے ؎ کاوِ کاوِ سخت جانی.............. نہ پوچھ کی جگہ، مپرس ہوتا تو فارسی کا مصرع صاف تھا۔ بخلاف مومن خاں کے کہ ان کے مصرع ایسے پیچیدہ الفاظ، تعضیب وتعقید سے مملو ہوتے ہیں کہ جس سے مضمون میں پیچیدگی آجاتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ نہیں۔

2۔ دوسری صورت یہ کہ آخر عمر میں غالب نے محاورات اور سلاست کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی فارسی کا مذاق چھپا چھپا ایسا رکھا ہے کہ دل کو لبھالیتا ہے۔ مثالاً چند شعر دونوں طرز کے لکھتا ہوں۔

طرز اول:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

طرز دوم:

ملتی ہے خوی یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
ہے [1] تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو شراب میں

تو ہم لوگ غالب کو اچھا اس سبب سے سمجھتے ہیں کہ طرز بندش اور صفائی بیان میں سب شعرائے دلی سے اعلیٰ اور زبان فارسی میں یکتا تھے۔ اب میں مثالاً ذوق، مومن، غالب کا کلام لکھتا ہوں تا کہ معلوم ہو جائے کہ غالب میں صفائی کیسی ہے اور ان دونوں میں گنجلک کیسی؟

مقابلہ ذوق و غالب:

ذوق:

مزے یہ دل کے لیے تھے، نہ تھے زبان کے لیے　　سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کے لیے

غالب:

زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

یا

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا　　اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے　　جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

---

1 مطبوعہ نسخے میں "تیوڑی جو ہے چڑھی ہوئی" درج ہے، مگر یہاں مصرع میں ذرا سی تبدیلی ہے۔

باقی رہی زبان دانی، ان کے سوائے چند محاورات خاص دہلی کے جس کے خود مرزا غالب قائل ہوئے ہیں، چہ غالب، چہ مومن، چہ نصیر وغیرہ سب دہلوی اور سب لکھنوی کہیں کے رہنے والے ہوں۔ بشرطیکہ انھوں نے لکھنؤ یا دہلی میں نشو ونما پائی ہو اور اساتذہ کے خاندان سے منسوب ہوں، اول درجہ کے ہیں اور دوسرا محاورات میں درجہ عوام وخواص کا ہے، اور تیسرا درجہ بازاریوں کا ہے۔

اور شہروں کے اعلیٰ ترین خواص...... اور بازاریوں کے تقابل نہیں...... اور یہی رائے انشاء اللہ خاں کی بھی ہے۔ مگر یہ بات فقط دہلی ولکھنؤ کے واسطے ہے۔ بسبب اجتماعِ سلطنت واہلِ علم وفن کے۔ ایسی حالت میں قصباتی یا دوسرے شہر کے رہنے والوں کو تمام اہل دہلی ولکھنؤ کی تقلید جائز ہے۔ مگر کسی بات میں محاورے اور تذکیر وتانیث میں جب تک اختلاف اُن میں نہ ہو، اور جس محاورے وتانیث وتذکیر میں اختلاف ہو، اس میں سے اسی محاورے کو ماننا چاہیے جس مقام کی تقلید اسے پسند ہو[1]۔ یعنی لکھنؤ کی یا دہلی کی۔ مگر حالی نے کیا خوب کیا ہے:

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح   اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی وصائب واسیر و کلیم   لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے   ہے ادب شرط، منھ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت   خاک کو آسماں سے کیا نسبت

باقی بحث تو زباندانیِ دہلی ولکھنؤ میں آہی جاتی ہے۔ ناسخ کی سالمیت سے انکار اور بحر سے بداعتقادی کا شکوہ بھی بے جا ہے۔ ہاں آتش کے طرز عاشقانہ کے موجد ہونے میں کلام کیا ہے۔ سُنیے، گو کہ وہ خوشہ چینِ تھے پھر بھی ان کی زبان میں پورب پچھّم کا فرق بہت ہے۔ نہ دلّی نہ لکھنؤ، اپنی الگ ایجاد ہے۔

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی عفی عنہ

بتاریخ 7/ جون 1883ء/ 30/ رجب المرجب 1300ھ

(آج کل، فروری 1957ء)

---

1. صفیر بلگرامی مرثیہ میں مرزا دبیر لکھنوی سے اور غزل میں جناب غالب دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن دلّی کی زباندانی کے قایل تھے۔

سید قدرت نقوی

غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب

مرزا غالب کے خطوط ان کی زندگی ہی میں وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے، چنانچہ سب سے پہلے منشی شیونرائن نے غالب کو خطوط کی اشاعت کے متعلق لکھا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے 18 رنومبر 1858ء کے مکتوب میں اشاعت کی مخالفت کی اور اس کو زائد بات کہہ کر ٹال دیا۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے بھی انہی ایام میں اشاعت خطوط کے متعلق لکھا اور کافی زور دیا۔ تفتہ کو بھی مرزا صاحب نے 20 رنومبر 1858ء کے خط میں صاف جواب دے دیا اور لکھ دیا: ''رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے، لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔''

دو سال بعد منشی عبدالغفور سرور مارہروری اور منشی ممتاز علی خاں میرٹھی نے غالب کو بغیر خبر کیے خطوط کی اشاعت کا ارادہ کرلیا۔ سرور نے اس کا نام مہر غالب رکھا اور دیباچہ بھی لکھ کر خاں صاحب کو دے دیا۔ ابھی طباعت کا کام شروع نہ ہوا تھا کہ ممتاز علی خاں کو پتہ چل گیا کہ منشی غلام غوث بیخبر بھی ایک مجموعہ مکاتیب مرتب کرر ہے ہیں۔ یہ کام غالب کی اجازت اور امداد سے ہورہا تھا، ان سے رابطہ قائم کر کے ممتاز علی خاں نے ان کے جمع کردہ خطوط بھی منگا لیے اور عود ہندی کے نام سے شائع کرنے کی کوشش کی جانے لگی، لیکن طباعت میں تاخیر ہوئی۔ احباب کا تقاضہ ہوا تو غالب نے خود اشاعت خطوط میں ''اکمل المطابع'' دہلی کے کارپردازان کا ہاتھ بٹایا اور خطوط کی نقول فراہم کیں۔ اس مجموعہ کا نام ''اردوئے معلیٰ'' قرار پایا۔

ان حضرات کے پیش نظر خطوط غالب کے وہ اہم پہلو نہیں تھے، جو آج ہیں۔ اسی بنا پر ''عود ہندی'' اور ''اردوئے معلیٰ'' میں ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ اردوئے معلیٰ میں صرف ایک

نظر یہ کارفرما تھا کہ سہل خطوط ابتدا اور مشکل خطوط آخر میں ہوں۔ چنانچہ یہی ترتیب ایک مدت تک قائم رہی۔ مجیدی پریس کانپور میں جب اردوئے معلٰی 1922ء میں طبع ہوئی تو مولوی محمد منیر صاحب نے حصہ اول و دوم کو یکجا کر کے ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے، یکجا جمع کر دیے۔ لیکن اردوئے معلٰی مطبوعہ لاہور میں وہی قدیم ترتیب قائم رہی البتہ ضمیمہ میں کچھ خطوط کا اضافہ ہوگیا جو قدر بلگرامی اور لطیف احمد بلگرامی کے نام ہیں۔ یہ خطوط مولانا حسرت موہانی کے رسالہ اردوئے معلٰی سے نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن مرتب شیر محمد سرخوش صاحب نے کوئی حوالہ درج نہیں کیا۔

منشی مہیش پرشاد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کچھ خطوط تاریخی اعتبار سے ترتیب دے کر ''خطوط غالب'' کے نام سے طبع کرائے۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے عود ہندی اور اردوئے معلٰی کی ترتیب بدل کر ہر مکتوب الیہ کے نام کے جملہ خطوط بلحاظ تاریخ مرتب کر کے خطوط غالب کے ہی نام سے دو جلدوں میں طبع کرائے جن میں چند خطوط ایسے بھی ہیں جو عود ہندی اور اردوئے معلٰی میں نہیں تھے، بلکہ مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا کوششوں کے باوجود اب تک خطوط غالب میں ترتیب کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ متن میں لفظی اور تاریخی غلطیاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تاریخی ترتیب اور صحت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگر مکمل صحت کے ساتھ تاریخی ترتیب قائم ہو جائے تو ہمیں بعض تاریخی واقعات کا صحیح طور سے اندازہ ہوسکتا ہے مثلاً جنگ آزادی 1857ء کے بعد دہلی اور اہل دہلی پر جو ظلم وستم کیے گئے، ان پر کما حقہ روشنی پڑسکتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ''غالب کا روزنامچہ'' خطوط غالب سے مرتب کیا تھا لیکن خطوط کی تاریخی ترتیب درست نہ تھی۔ اسی وجہ سے واقعاتی تسلسل اس میں برقرار نہ رہ سکا۔

غالب کے جملہ خطوط پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلحاظ تاریخ حسب ذیل نوعیت رکھتے ہیں:

(1) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت ہے۔

الف۔ صحت تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

ب۔ صحت تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

(2) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت نہیں ہے۔

الف۔ تعین تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

ب۔ تعین تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

خطوط کی مندرجہ بالا نوعیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند خطوط پر بطور مثال روشنی ڈالی جاتی ہے۔

''اردوئے معلّٰی'' میں سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح، دوسرے مکتوب الیہ ہیں۔ ان کے نام کل 35 خط ہیں۔ صرف ایک خط کے علاوہ تمام خطوط پر تاریخ درج ہے۔ یہ 11/ جون 1860ء سے 25/ اگست 1868ء تک لکھے گئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے جب ان خطوط کو مرتب کیا جاتا ہے تو ہر سن کے خط الگ کر کے ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن دشواری یہ پیش آتی ہے کہ دن اور تاریخ بعض خطوط پر درج ہیں، سنہ درج نہیں۔ مثلاً خط 33 ''اردوئے معلّٰی'' کانپور 28، اسی قسم کا خط ہے۔ اس کی تاریخ غالب نے اس طرح تحریر کی ہے۔ سہ شنبہ 11/ محرم الحرام، 31/ جولائی سال حال۔ سنین ہجری وعیسوی تقویم یا دیگر خطوط کی مدد سے متعین کیے جاسکتے ہیں کہ 1860ء اور 1277ھ ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور خط 7 اردوئے معلّٰی کانپور ہے جس کی تاریخ ''صبح سہ شنبہ 20/ ذی القعد ومئی معاً'' مطبوعہ ہے، لیکن اردوئے معلّٰی لاہور اور خطوط غالب لاہور میں ''شنبہ 2/ ذی قعد ومئی معاً'' طبع ہوا ہے۔ بیس صفر اور سہ شنبہ کا لفظ 'سہ' مندرج نہیں جو ابتداءً کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے، بعد کو کسی نے غور نہ کیا اور یہ غلطی آج تک برقرار رہی۔ اگر تقویم کی مدد لی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے کہ 1862ء اور 1278ھ میں مئی و ذی قعد کی تاریخیں یکساں تھیں اور 2/ مئی کو 1862ء میں جمعہ واقع ہوتا ہے۔ شنبہ نہیں اور 20/ مئی کو سہ شنبہ واقع ہوتا ہے۔ اس لیے اردوئے معلّٰی کانپور میں تاریخ صحیح ہے۔

خط 29 ''اردوئے معلّٰی'' کانپور ایسا خط ہے جس پر کوئی تاریخ طبع نہیں ہوئی ہے۔ خطوط غالب لاہور میں اس کا نمبر چھ ہے اور اس کو خط نمبر 5/ مورخہ 12/ فروری 1861ء اور خط 7، 27/ فروری کے درمیان قرار دیا ہے۔ اس خط میں یہ ایک فقرہ تعین تاریخ میں مدد دیتا ہے۔

''تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ کرلیا کرو

اور دبتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔''

فاضل مرتب خطوط غالب نے اسی فقرہ کو اساس قرار دے کر 12رفروری کے خط کو مقدم اور اس کو موخر قرار دیا لیکن یہ خط 12رفروری سے پہلے کا ہے، کیونکہ: (1) غالب نے 12رفروری اور 27رفروری کے خطوط میں رجب علی بیگ سرور کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر میں بھی مشورہ کے متعلق لکھا ہے اور موخر الذکر میں سیاح کی غلط فہمی دور کی ہے۔ ان تینوں خطوط کے فقرے علی الترتیب درج ذیل ہیں۔

1۔ ''تذکیروتانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سرور سے مشورہ کرلیا کرو اور دبتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔'' (خط بغیر تاریخ)

2۔ ''نام تمہارا آسکتا ہے لیکن الف دبتا رہتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔'' (12رفروری 1861ء)

3۔ ''بھائی ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ، اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ، ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیروتانیث کو ان سے پوچھ لیا کرو۔ (27رفروری)۔

خط 2 کی مدد سے خط 3 کا سن بآسانی متعین ہوسکتا ہے اور اگر فقرات پر گہری نظر ڈالی جائے تو خط 1 کو خط نمبر 2 سے مقدم تسلیم کیا جاسکتا ہے کیونکہ پہلے فقرہ میں صرف تاکید ہے اور دوسرے میں تاکید پر زور دیا گیا ہے۔ اسی تاکید مزید کو سیاح اشارہ شاگردی پر محمول کر بیٹھے اور غالب سے معلوم کیا کہ کیا کلام بھی ان کو دکھایا کروں جس کا جواب غالب نے خط 3 میں دیا۔ بادی النظر میں خط 1، خط 3 سے ہی مقدم معلوم دیتا ہے کیونکہ دونوں میں تذکیروتانیث کا ذکر ہے اور اسی سے یہ سہو واقع ہوا۔ لیکن تاکید اور تاکید مزید پر غور کیا جائے تو ترتیب بالا ہی درست ہے۔ (2) اس خط کو اول قرار دینے کے لیے ایک خارجی پہلو یہ ہے کہ غالب کے زمانہ میں ڈاک کا انتظام اتنا عمدہ نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے سورت تک سفر تین چار شبانہ روز میں طے ہوتا تھا (خط 6 بنام غلام بابا) ڈاک کا ہفتہ بھر میں پہنچنا یقینی امر ہے۔ غالب نے خود سیاح کو ایک خط کے ملنے کی اطلاع اس طرح دی ہے۔ ''تمہارا خط مرقومہ 30راگست پرسوں بروز جمعہ

8/ستمبر 1865ء کو پہنچا۔'' گویا یہ خط سورت سے دہلی دس دن میں آیا۔ اگر ہم ایک ہفتہ اوسط مقرر کرلیں تو 12/فروری کا تحریر کردہ خط 19/یا 20/فروری تک سیاح کے پاس پہنچا۔ اگر سیاح نے فوراً جواب لکھ دیا ہو تو غالب کے پاس 26/یا 27/فروری تک پہنچا ہوگا۔ چنانچہ اسی تخمینہ کے مطابق 12/فروری کے بعد 27/فروری کا خط موجود ہے۔ درمیان میں خط کا بھیجنا قرین قیاس نہیں۔ سیاح اس زمانہ میں بنارس میں تھے، وہاں سے بھی ڈاک ایک ہفتہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ نیز 31/دسمبر 1860ء کے خط کے بعد یہ خط ہے جو غالباً 20/جنوری کو لکھا گیا ہوگا، لہٰذا یہ خط جنوری 1861ء کے عشرہ ثانی کا قرار پاتا ہے اور ترتیب میں اس کا پانچواں نمبر ہے۔

خط 25 ''خطوط غالب'' جلد دوم صفحہ 67 کی تاریخ 17/جون 1866ء طبع ہے۔ ''اردوئے معلیٰ''، کانپور اور لاہور میں تاریخ کے ساتھ دن سہ شنبہ بھی چھپا ہے، خطوط غالب میں نہ معلوم کس بنا پر دن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سنہ تینوں کتابوں میں غلط چھپا ہے۔ اس خط کی صحیح تاریخ، سہ شنبہ 17/جون 1862ء ہے۔ دو اور چھ کے ہندسے میں غلطی کا قوی امکان ہے۔ ناقل یا کاتب نے دو کو چھ سے بدل دیا اور یہ غلطی برقرار رہی۔ اس خط کی تاریخ متعین کرنے کے سلسلہ میں امور ذیل پر نظر رکھی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خط 1862ء ہی کا ہے۔

(1) سہ شنبہ 17/جون کو 1862ء میں واقع ہوتا ہے۔ غالب کی حیات میں اور کسی سنہ میں واقع نہیں ہوا جب سے کہ سیاح سے تعلقات قائم ہوئے، البتہ 7/جون سمجھ لیا جائے تو 1864ء اور 27/جون خیال کرلیں تو 1865ء مطابقت کی جا سکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی قرینہ موجود نہیں، تاریخ اور دن کے ہر امکانی اختلاف کو سامنے رکھ کر اگر کوشش کریں تو 1866ء سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں ہوتی۔

(2) خط زیر بحث میں بریلی سے آموں کا آنا بیان کیا گیا ہے، جنوں بریلوی کے نام کے خطوط میں 1864ء میں 28/جون کو اکیس بیس آموں کا پہنچنا بیان کیا گیا ہے۔ (خط 24 بنام جنوں) اور سیاح کے خط میں دو سو آم غالب نے وصول پائے، جس میں کل تراسی آم اچھے اور ایک سو سترہ خراب نکلے۔ 8/جون 1866ء کو (خط 28 بنام جنوں بریلوی) آم ملنے کی اطلاع پھر جنوں کو دی گئی ہے: ''جمعہ کے دن 8 جون کو دوپہر کے وقت کہار پہنچا۔'' 8/جون جمعہ کے دن 1866ء میں واقع

ہوتی ہے لیکن غالب سیاح کو لکھتے ہیں۔ ''اے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی''، گویا 17/جون کو آم ملے، لہٰذا یہ خط 1866ء کا نہیں، کیونکہ جنوں کو 8/جون کو خط لکھا گیا، آم 8/کو وصول ہوئے 17/جون کو نہیں۔

(3) خط زیر بحث میں غالب نے سیاح کو میر غلام بابا کے متعلق لکھا ہے: ''میر غلام بابا خانصاحب واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو، سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے، لاریب فیہ'' میر غلام بابا سے 63ء میں غالب کی خط و کتابت شروع ہوگئی تھی۔ (خط 1 بنام غلام بابا) اور 1866ء تک میر صاحب غالب کی امداد بھی کر چکے تھے۔ (خط 4 بنام غلام بابا) ان حالات کی روشنی میں یہ عبارت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ غالب خود مداح تھے اور سیاح کا تین چار سال بعد مداح ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ سیاح سورت میں میر غلام بابا کے پاس مئی 1862ء میں پہنچے (خط 11 بنام سیاح) جون کے اوائل میں سیاح نے خط لکھا جس میں غلام بابا کی تعریف لکھی۔ غالب نے اس کے جواب میں یہ خط لکھا۔ بنابریں یہ خط سہ شنبہ 17/جون 1862ء کا ہے۔ 1866ء کا نہیں اور ترتیب میں اس کا نمبر 12 ہونا چاہیے۔

اسی طرح خط 27 خطوط غالب جلد دوم کی تاریخ سہ شنبہ 18/نومبر 1866ء درج ہے۔ اس خط کا سنہ بھی غلط چھپا ہے 1862ء ہونا چاہیے۔ وجوہ درج ذیل ہیں۔

1۔ سہ شنبہ 18/نومبر 1862ء کے مطابق ہے، 18/نومبر 1866ء کو دن یکشنبہ واقع ہوتا ہے۔

2۔ خط 28 بنام سیاح محررہ 3/جنوری 1867ء میں تحریر ہے۔ ''ربیع الاول میں تمہارا خط آیا۔ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی 26 ہے۔ صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں، 8 بج گئے ہیں۔ اس وقت تک نہ کوئی تمہارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ، واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو۔'' اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط کو آئے ہوئے تقریباً پانچ ماہ گزر چکے ہیں۔ خط 26، 5/ستمبر 1866ء کا تحریر کردہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے سیاح کے خط کا جواب دیر سے دیا ہے، فوراً نہیں۔ نیز سیاح کا خط ربیع الاول کے آخر میں آیا ہوگا۔ بہر حال اس خط کے حساب

سے یہ عرصہ تقریباً درست ہے۔ نومبر کے خط زیر بحث کی موجودگی میں غالب کا یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ تمہارا اور نواب صاحب کا کوئی خط آج بھی نہیں آیا۔ حالانکہ خط زیر بحث میں غالب نے خود لکھا ہے۔ ''پہلا خط تمہارا مع قصیدہ پہنچا'' یعنی اس خط سے پہلے بھی ایک خط مع قصیدہ آ چکا تھا۔ لہٰذا یہ خط 1866ء کا نہیں ہے۔

3۔ خط 26 بنام سیاح میں تصویر کا ذکر ہے اور جشن میں شرکت سے معذوری کا اظہار ہے۔ اس خط 27 مورخہ 18/نومبر میں، ان میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں حالانکہ 14/نومبر 1866ء کو میر غلام بابا کے خط 7 میں شرکت جشن سے معذوری کا بیان بہ حسرت موجود ہے۔ نیز خط کے آخر میں سیاح کو مخاطب کر کے تصویر کے متعلق لکھا ہے۔ ''ایک میرے دوست مصور، خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے کو اکبر آباد گئے ہیں، وہ آ جائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔''

وجوہ مندرجہ بالا کی بنا پر یہ خط سہ شنبہ 18/نومبر 1862ء کا ہے، 1866ء کا نہیں، اور اس کا نمبر 13 ہے 27 نہیں۔

خط 22 خطوط غالب جلد دوم کی تاریخ، یکم مارچ 1866ء درج ہے لیکن اردوئے معلّٰی کانپور اور لاہور میں تاریخ کے ساتھ دن سہ شنبہ طبع ہوا ہے۔ یہ خط بھی 1866ء کا نہیں ہے بلکہ 1864ء کا ہے۔ یہ سن کی تبدیلی سہو کاتب کے سبب واقع ہوئی جس کی طرف بعد کو کسی نے غور نہیں کیا اور برقرار رہی۔ اس سلسلہ میں وجوہ ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

1۔ اردوئے معلّٰی کانپور اور لاہور میں دن سہ شنبہ طبع ہوا ہے۔ دن کی جب تاریخ سے مطابقت کی جاتی ہے تو 1864ء برآمد ہوتا ہے۔

2۔ اسی خط میں غالب نے سیاح کو لکھا ہے: ''بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیاح نے مجھ کو یاد نہیں کیا، کل ناگاہ تمہارا خط پہنچا'' حالانکہ 1866ء میں ''درفش کاویانی'' کی طباعت کے سلسلہ میں غالب اور سیاح کی خط و کتابت جلد جلد ہو رہی تھی۔ 20/فروری 1866ء کو سیاح کا خط ملا اور 21/فروری 1866ء کو غالب نے جواب دیا ہے۔ (خط 21) اور لکھا: ''کل ہی شام کے وقت آپ کا عنایت نامہ پہنچا''، لیکن زیر بحث خط میں غالب کہتے ہیں،

''تمہارا کوئی خط سوائے اس خط کے جس کا جواب لکھتا ہوں ہرگز نہیں پہنچا''، 23رجنوری کو غالب نے خط لکھا تھا جس میں ''درفش کاویانی'' کی ترسیل میں جو دشواریاں تھیں ان کو لکھ کر جواب مانگا تھا۔ سیاح نے جواب دیا وہ 20رفروری تک غالب کے پاس پہنچا۔ 21رفروری کو غالب نے جواب دیا۔ اب یکم مارچ کو خط میں لکھنا کہ بہت دنوں سے خط نہیں آیا، چہ معنی دارد؟ خط میں گاہ گاہ خط بھیجنے کی تاکید کا کیا مطلب؟ ظاہر ہے کہ یہ خط 1866ء کا نہیں ہے بلکہ 1864ء کا ہے کیونکہ 6راگست 1863ء خط 12 کے بعد یکم مارچ 1864ء تک ایک طویل عرصہ ہے جس میں خط وکتابت کا سلسلہ منقطع رہا۔

3۔ اگر ترسیل خط کے زمانہ کو پیش نظر رکھا جائے تو بالکل واضح ہے کہ 21رفروری کے بعد یکم مارچ کو خط بغیر کسی خاص وجہ کے نہیں لکھا جاسکتا۔ کیونکہ 21رفروری کا لکھا ہوا خط یکم مارچ تک تو شاید سیاح کو بھی نہ ملا ہو۔ چہ جائیکہ غالب جواب لکھتے۔ پھر 22رمارچ کا خط موجود ہے جو بیّن ثبوت ہے کہ یکم مارچ کا خط اس زمانہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے سال سے تعلق رکھتا ہے۔ دن کو اساس قرار دے کر سنہ تلاش کیا جائے تو 1864ء برآمد ہوتا ہے۔

4۔ اگر خطوط مقابل و مابعد پر گہری نظر ڈالی جائے تو 23رجنوری، 21رفروری، 22رمارچ کے خطوط کی عبارت میں ربط وتسلسل معنوی موجود ہے۔ 22رمارچ ہی کو ایک خط غلام بابا کو لکھا ہے۔ اس کے اور سیاح کے خط کے مضمون میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن یکم مارچ کے خط کی عبارت خود بتا رہی ہے کہ میرا مقام یہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا شواہد کی بنا پر یہ خط یکم مارچ 1864ء کا ہے۔ سہ شنبہ کی اسی سنہ میں مطابقت ہوتی ہے، ترتیب میں اس کا نمبر 15 ہونا چاہیے۔

خط 35، خطوط غالب، جلد دوم 175 کی تاریخ 25رجنوری 1868ء طبع ہوئی ہے۔ احوال غالب 229 پر مختارالدین آرزو نے بھی 1868ء لکھا ہے۔ اردوئے معلیٰ مطبوعہ لاہور میں بھی 1868ء درج ہے۔ اس خط کی تاریخ کے سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اردوئے معلیٰ کے پہلے نسخہ مطبوعہ اکمل المطابع دہلی 1285ھ (1869ء) میں اس کا سنہ 1867ء طبع ہوا۔ (بشکریہ مولانا

عرشی)، اور اردوئے معلیٰ کانپور میں بھی 1867ء چھپا ہے، لیکن 1930ء میں جب شیخ مبارک علی نے اردوئے معلیٰ طبع کرائی تو 1867ء، 1868ء سے بدل گیا۔ خطوط غالب اور احوال غالب میں اسی نسخہ سے تاریخ نقل ہوئی ہے۔ اردوئے معلیٰ دہلی اور کانپور سے قطع نظر کرتے ہوئے خط کی عبارت پر غور کیا جائے تو بوجوہ ذیل 1867ء ہی کے نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

1۔ خط مذکورہ میں سب سے پہلا فقرہ: ''صاحب تمہارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی۔'' خط ماسبق یعنی خط 28، 3/جنوری 67ء کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں غالب نے لکھا تھا:

''ربیع الاول میں تمہارا خط آیا تھا...... اس وقت تک نہ کوئی تمہارا خط آیا نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔''

2۔ خط 28، 3/جنوری میں ٹوپیوں کی ترسیل مذکور ہے۔ زیر بحث خط میں انہی ٹوپیوں کے متعلق غالب نے لکھا، ''ٹوپیاں اگرچہ تمہارے سر پر ٹھیک نہ آئیں لیکن ضائع نہ گئیں، میرے شفیق اور تمہارے مربیّ کے صرف میں آئیں۔'' آخر میں پھر ٹوپیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''نواب صاحب کو میرا اسلام کہنا، اور میری زبانی کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغاں سمجھنا، سیف الحق کی نذر تصور نہ کرنا۔'' اس کے بعد خط 29، 12/فروری 1867ء میں جب کہ سیاح کو یہ امر ناگوار گزرا ہوگا کہ ٹوپیاں میں نے نذر کیں اور وہ ارمغان غالب بن گئیں تو ٹوپیوں کی حقیقت معلوم کی۔ غالب نے لکھا، ''صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے لطائف غیبی کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں، پھر دو روپے کے ٹکٹ بھیج کر ٹوپیاں منگوائیں۔ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے روپیوں کی لطائف خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہو تم پہنو، چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔'' ٹوپیوں سے متعلق تینوں خطوط کے فقرات میں ربط و تسلسل ہے۔ بالخصوص 25/جنوری اور 13/فروری کے خط سے ارمغان و نذر کا تعلق بدرجہ اتم ظاہر ہے۔ غالب شاید اس خط کا جواب زیادہ سختی سے دیتے لیکن چاہو تم پہنو، چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو، لکھ کر معاملہ ختم کر دیا، کیونکہ اسی زمانہ میں سیاح کے نام سے ایک اعتراض قتیل پر شائع کرایا تھا۔ اس وجہ سے یہ معاملہ ختم کرنا پڑا کہ سیاح ناراض نہ ہو جائیں۔

3۔ خط مذکورہ میں تعین سنہ کے لیے ایک اور قرینہ بھی پایا جاتا ہے جس نے غالباً مولف ''احوال غالب'' کو مغالطہ میں ڈالا یعنی تصویر کا ذکر ''مصور سے سخت عاجز ہوں، وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں۔'' سیاح نے تصویر کی فرمائش 5 رستمبر 1866ء سے قبل کی تھی جس کا جواب غالب نے خط 26 رمورخہ 5 رستمبر 1866ء میں دیا، بعدازاں 14 رنومبر 1866ء کو میر غلام بابا کے خط 7 میں سیاح کو سلام لکھنے کے بعد لکھا ''ایک میرے دوست مصور، خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے کو اکبرآباد گئے ہیں، وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔'' جنوری میں پھر تقاضا ہوا تو غالب نے مذکورہ بالا خط 25 رجنوری میں اس کا جواب دیا۔

اس کے بعد خط 33 رمورخہ 11 رجون 1867ء میں تصویر کے متعلق تحریر فرمایا۔ ''تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اُتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے، آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشہ اتروانا بھی، ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، یہ پانچواں مہینہ ہے، آج تک نہیں آئے۔'' اس تحریر سے ظاہر ہے کہ مصور تین مہینے سے اور فوٹوگرافر پانچ مہینے سے نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مصور نومبر 1866ء میں خاکہ اتار چکا تھا جو یقیناً دوسرا تھا۔ کیونکہ اگر پہلے مصور کا ذکر ہوتا تو عرصہ آٹھ ماہ کا ہوتا ہے تین ماہ کا نہیں۔ پہلے مصور نے وعدہ پورا نہ کیا جس کا ذکر 25 رجنوری کے خط میں ہے تو پہلے فوٹو بنوانے کی کوشش کی، اس کے بعد کسی دوسرے مصور سے تصویر بنوانا چاہی۔ اس نے بھی یہ کام ادھورا چھوڑا۔ اگر یہ خط 1868ء کا ہوتا تو اس میں بھی مصور کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافر کا ذکر ہوتا جب کہ غالب کی آخری تصویر فوٹوگراف ہی ہے جو سیاح کو غالباً اگست 1868ء میں بھیجی گئی تھی۔

۴۔ غالب نے فروری 1868ء میں ایک اعتذار ''اکمل الاخبار'' میں شائع کرایا تھا جس کے متعلق سیاح سے 29 راپریل 1867ء خط 32 میں استفسار کیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے

اکثر وبیشتر خطوط میں ذکر پیری وضعف بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ خط 34/ مورخہ 25/ اگست 1867ء کا خط پڑھا جائے۔ اس کے بعد اس خط کو پڑھا جائے تو دونوں کے طرزِ تحریر میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ پہلے میں حزن ویاس کا عالم ہے اور دوسرے میں غالب کی طبعی شوخی موجود ہے۔ عبارت بھی شگفتہ ہے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا، کیونکہ غالب کی صحت نے جواب دے دیا تھا، وہ خود خط تک نہیں لکھ سکتے تھے، شوخی طبع بالکل مفقود تھی جس کا اندازہ 25/ اگست کے خط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے لیکن اس 25/ جنوری کے خط میں شوخی نمایاں ہے۔ بنابریں یہ خط 1867ء کا ہے 1868ء کا نہیں، اور ترتیب میں اس کا نمبر 29 ہونا چاہیے۔

اس مضمون میں چند خطوط، ان کی صحیح تاریخ متعین کر کے اربابِ علم ودانش کے سامنے پیش کیے جارہے ہیں۔ غالب کے تمام خطوط اسی طرح مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ راقم الحروف اب تک مطبوعہ خطوط کی جو ترتیب کر سکا ہے، اس کی کیفیت حسب ذیل ہے۔

1۔ عود ہندی اور اردوئے معلّیٰ میں ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔

2۔ اردوئے معلّیٰ کانپور میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے، یکجا کر دیے گئے، اختلاف تاریخ برقرار رہا۔

3۔ خطوط غالب از مہیش پرشاد اور خطوط غالب از مولانا مہر میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے، وہ تاریخی ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں۔ مکاتیب غالب از مولانا عرشی اور نادرات غالب از آفاق دہلوی کی ترتیب بھی اسی نوعیت کی ہے۔

اب تک خطوط غالب کی ترتیب کے یہ تین پہلو ظاہر ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کو ایک اور نوعیت سے بھی ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ یعنی مکتوب الیہم کو پیش نظر رکھ کر نہیں، بلکہ دن تاریخ اور سن کے اعتبار سے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ غالب کی زندگی کے متعلق واقعاتی تسلسل قائم ہو جائے گا اور خطوط کے مطالعہ سے کتنے ہی اہم پہلو اجاگر ہو جائیں گے جو اس جداگانہ اور مختلف ترتیب میں نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔

(ماہِ نو، کراچی۔ فروری 1959ء)

نادم سیتاپوری

غالب کے دو اور خط

غالب کے جو خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں، اکثر و بیشتر ان کے دوستوں یا بے تکلف شاگردوں کے نام ہیں۔ عزیزوں یا رشتہ داروں کے نام شاید ہی کوئی خط ہوں۔ اور ہوتے بھی کیوں؟ اپنی سات اولادوں کو اپنے ہاتھ تہ خاک سلا چکے تھے۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خان کو بیٹا بنایا، وہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ رہے سہے چند سسرالی رشتہ دار تھے، ان کا ذکر جا بجا ضرور ملتا ہے۔ شاید کچھ خطوط بھی ''لوہارو خاندان'' میں ہوں، مگر یہ سسرالی رشتہ دار ہی تو تھے، ہم نسب یا قرابت داران طرفی تو نہیں تھے۔

غالب لاولد مرے۔ سگے بھائی مرزا یوسف کی ایک صاحبزادی عزیز النسا اس خاندان کی مایۂ بساط کہی جا سکتی تھیں یا پھر مرزا کی بہن کی اولاد، جو مرزا اکبر بیگ بدخشی کو بیاہی گئی تھیں۔ ان کے سوا غالب کے باقیات الصالحات میں کوئی تھا ہی کہاں؟ جس سے رابطۂ قرابت قائم رہتا۔ لیکن بدنصیبی دیکھیے، اس خاندان میں بھی غالب کے کوئی خطوط نہیں ملتے۔ بہت تلاش و جستجو کی مگر اس وقت تو کامیابی ہوئی نہیں۔

غالب کے جو خطوط دوستوں اور شاگردوں کے نام ہیں، فنّی اعتبار سے انھیں اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن انھوں نے جو خطوط اپنے خاص اعزہ کو لکھے ہوں گے، اگر وہ بھی سامنے آجائیں تو غالب کی گھریلو زندگی کے وہ پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں جو ہمیشہ تصنع و تکلف سے پاک و صاف رہی۔ اس قسم کے صرف دو خطوط اب تک مجھے مل سکے ہیں جو انھوں نے اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ، اور ان کے بھتیجے مرزا محمود بیگ کو لکھے تھے۔ یہ دونوں خطوط تقریباً تیں

سال ادھر پہلی بار ماہنامہ ''خیابان''، لکھنؤ بابت ماہ نومبر 1933ء (جلد 2، شمارہ 2) میں شائع ہوئے تھے اور جہاں تک میرے علم میں ہے، یہ خطوط اس کے بعد پھر کبھی شائع نہں ہوئے اور آج بھی عام دسترس سے باہر ہیں۔ یہ دونوں خطوط ماہنامہ خیابان کے ایک مستقل عنوان ''گنج شائگان'' کے تحت صفحات 28 الغایۃ 132 پر شائع کیے گئے تھے اور سید شہنشاہ حسین رضوی ایڈیٹر (خیابان) نے اس پر ایک تفصیلی نوٹ بھی تحریر فرمایا ہے۔ سید صاحب مرحوم نے لکھا تھا۔

''ذیل کے ہر دو خطوط نواب سید محمد ذکی علی خاں ہاتف لکھنوی کا عطیہ ہیں۔ پہلا خط مرزا عباس بہادر اور دوسرا خط محمود مرزا کے نام ہے اور دونوں صبح شنبہ 23/ذی القعدہ 1279ھ مطابق 12/مئی 1863ء کو لکھے گئے ہیں اور آج سے قبل کبھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔

مکتوب الیہم اپنے زمانے میں غیر معروف نہ تھے لیکن اب ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے بہت کم ہیں۔ مرزا عباس بہادر سے مراد ڈپٹی مرزا عباس بیگ مرحوم ہیں جو لکھنؤ خیالی گنج کچہری روشن الدولہ کے جانب جنوب میں رہتے تھے۔ یہ کوٹھی امپرومنٹ ٹرسٹ لکھنؤ نے آرایش بلدہ کی اسکیم میں لے کر منہدم کرادی اور اب اس کا نشان تک باقی نہیں۔''[1]

مرزا عباس بیگ درحقیقت مرزا غالب مرحوم کے بھانجے[2] تھے لیکن محبت و بے تکلفی سے خط میں لفظ بھائی سے مخاطب کیا ہے۔ محمود مرزا جن کے نام دوسرا خط ہے، ڈپٹی مرزا محمود بیگ کے نام سے موسوم تھے اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے تھے۔ مرزا خداداد بیگ اور مرزا رفیع الدین بیگ جن کی خیر و عافیت محمود مرزا کے خط میں مرزا نے دریافت کی ہے، محمود مرزا کے حقیقی بھائی تھے۔ خداداد بیگ اور رفیع الدین بیگ کا بھی انتقال ہوگیا۔ نواب سرور جنگ بہادر جن کا حال میں انتقال ہوا ہے، محمود مرزا کے چچازاد بھائی اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے[3] تھے۔ اس خاندان کے بعض ارکان مختلف مقامات پر موجود اور ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ خود مرزا محمود بیگ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔

قدر بلگرامی کے نام مرزا نے جو خط لکھا ہے اس میں بھی بھتیجے[4] کی شادی میں شریک نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ لہٰذا جہاں تک کہ واقعات کا تعلق ہے، ذیل کے خطوط کی تصدیق قدر بلگرامی کے نام کے خط سے ہوتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرزا نے انتقال سے کچھ زمانہ قبل اپنے ہاتھ سے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن خطوط ذیل مئی 1863ء میں لکھے گئے ہیں اور مرزا نے 1868ء میں انتقال کیا۔ لہٰذا ہر دو خطوط ان کی وفات سے پانچ سال پہلے لکھے گئے ہیں اور اس امر میں مطلق اشتباہ کی گنجائش پیدا نہیں کرتے کہ وہ مرزا کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

''دونوں خط ہندوستانی قلم اور سیاہ روشنی سے لکھے گئے ہیں اور ایک ہی ورق پر پہلا خط دو صفحات پر ہے اور دوسرا تیسرے صفحہ پر۔ چوتھا سادہ ہے۔ خط روشن اور پاکیزہ ہے۔ ہم نے صرف دوسرے خط کا عکس شائع کیا ہے۔ پہلا طویل بھی ہے اور جا بجا سے کرم خوردہ بھی۔''

''ہر دو خطوط نواب سید محمد ذکی علی خاں ہاتف[5] کو نواب سید محمد قاسم عرف نواب ابراہیم مرزا خاں خلف نواب یوسف مرزا مرحوم سے حاصل ہوئے تھے اور یوسف مرزا، مرزا (غالب) کے محبوب تلامذہ میں سے تھے اور ان کے نام کے اکثر خطوط اردوئے معلیٰ، عود ہندی میں شائع ہوئے ہیں، ممکن ہے کہ یوسف مرزا کو مرزا غالب کے خطوط کو جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو اور انھوں نے مرزا عباس بیگ اور محمود مرزا سے خطوط منقولہ ذیل کو حاصل کرلیا ہو۔''

(مدیر مرتب)

یہ مرزا عباس بیگ بہادر غالب کے وہی بھانجے ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے سید غلام حسین قدر بلگرامی کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

''سید صاحب ...... تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خان بہادر کی رعایت وعنایت کا شکریہ ادا کیا ہے، تم کیوں شکرگزار ہوتے ہو۔

جو کچھ نیکی اور نکوئی اس اقبال نشان نے تمہارے ساتھ کی ہے، وہ بعینہ میرے ساتھ کی ہے۔ اس کا سپاس میں ادا کروں۔ خدا کی قسم دل سے دعائیں دے رہا ہوں۔"

"بھائی —— اس کا جوہر طبع از روئے فطرت، شریف ہے اور پروردگار اس کو سلامت رکھے اور مدارج اعلیٰ کو پہنچائے۔ یہ اپنے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے، پس وہ فخر میری طرف بھی عاید ہوتا ہے۔ وہ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ "ماموں" میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور صرفِ زر سے جی چرایا ہے۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ مگر کیا کروں۔ مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاش کہ جب ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا! جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے۔"

(ادبی خطوط غالب صفحہ 213 مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ)

مرزا عباس بیگ غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ بدخشی[6] کے منجھلے صاحبزادے تھے اور دوسرے مکتوب علیہ مرزا محمود بیگ اور ان کے بھائی خداداد بیگ اور رفیع الدین بیگ (وحشی) غالب کے بڑے بھانجے مرزا عاشور بیگ کے لڑکے تھے۔ مرزا عاشور بیگ اور مرزا عباس بیگ کے علاوہ غالب کے سب سے چھوٹے بھانجے مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) اور ایک بھانجی امانی خانم (زوجہ نواب علی بخش خاں لوہارو) بھی تھیں جن کے صاحبزادے نواب غلام فخرالدین خاں کو غالب کی حقیقی بھتیجی عزیز النساء (بنت مرزا یوسف) بیاہی گئی تھیں اور غالب کے بعد ان کے قریب ترین اعزہ میں سوائے ان لوگوں کے کوئی دوسرا نہ تھا۔

غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ بدخشی مغلوں کے مشہور قبیلہ 'برلاس' سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو کے مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ انہیں اکبر بیگ بدخشی کے حقیقی بھائی جواد الدولہ مرزا افضل بیگ کی نسل سے تھے۔ کسی زمانے میں یہ خاندان دہلی کے ممتاز خاندانوں میں شمار ہوتا تھا، جن کی قرابتیں براہ راست دہلی کے شاہی خاندان سے تھیں۔ ایک صدی سے کچھ زیادہ زمانہ گزرا

جب مرا عباس بیگ دہلی سے سیتا پور (یوپی) چلے آئے۔ غدر کے بعد انگریزوں نے اسی ضلع میں انھیں ایک تعلقہ (بڑا گاؤں تحصیل جھر کھہ) دے دیا تو یہ یہیں کے ہو رہے۔

مرزا عباس بیگ کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو تھے نہیں، لیکن ذہین اتنے تھے کہ زمانے کا رخ پہچان کر اپنے طور پر دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر دہلوی سے اتنی انگریزی بھی پڑھ لی تھی کہ کار منصبی بحسن وخوبی انجام دے لیتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی تو دیسی ریاستوں میں قسمت آزمائی کرتے گزری تھی، مگر جب یہ پھرتے پھراتے پنجاب پہنچے تو سر ہنری لارنس نے انہیں لاہور کا کوتوال مقرر کر دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی سے کچھ پہلے یہ ملاں[7] پور کی تحصیل داری پر بھیجے گئے، پھر دہلی سے نواب فرخ آباد کی معزولی کے سلسلہ میں فرخ آباد تعینات کر دیے گئے۔ جب غدر فرو ہوا تو انگریزوں نے انہیں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر ترقی دے دی اور پھر تھوڑے دنوں بعد ہی کمشنر سیتاپور وہردوئی کے اکسٹرا اسسٹنٹ بنا دیے گئے۔ اودھ کے سندی تعلقدار بن جانے کے بعد انھوں نے سیتاپور کو اپنا وطن بنالیا۔ لیکن انہیں جنوبی قیصر باغ کا ایک بڑا حصہ بھی مل گیا تھا اس لیے ان کا زیادہ قیام لکھنؤ میں رہتا تھا۔

انقلاب 1857ء میں مرزا عباس بیگ کے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ اور ان کے بڑے بیٹے مرزا احمد بیگ (شہید) چوک کے مورچہ پر 'کانے مٹکاف' سے دست بدست لڑ کر ملک ووطن پر نثار ہو گئے تو مرزا عباس بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) اپنے اہل وعیال اور بھتیجوں کو لے کر سیتاپور چلے آئے۔ دہلی کے اس لٹتے ہوئے قافلے میں مرزا عاشور بیگ کے تینوں لڑکے خداداد[8] بیگ، رفیع الدین[9] بیگ وحشی اور محمود بیگ کے علاوہ مرزا جواد بیگ کے چاروں صاحبزادے آغا مرزا بیگ (سرور جنگ)، مرزا فیاض بیگ، مرزا ساجد بیگ اور مرزا واجد بیگ بھی شامل تھے۔ ان سب کی ابتدائی تعلیم وتربیت مرزا عباس بیگ کی سرپرستی میں سیتاپور ہی میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ کے کنگ کالج میں، جو اب لکھنؤ یونیورسٹی بن چکا ہے۔ مرزا عاشور بیگ کی اولاد تو زیادہ تر یوپی ہی میں رہی لیکن مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) کے تین بیٹے آغا مرزا بیگ (نواب سرور جنگ) مرزا ساجد بیگ اور مرزا واجد بیگ مرحوم ریاست حیدر آباد دکن میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہوئے اور یہ خاندان وہیں رہ بس گیا۔ نواب سرور جنگ کا شمار تو حیدر آباد کے ممتاز

امراء وعمائدین میں تھا۔ انھیں آصف جاہ میر محبوب علی خاں (نظام دکن) کی استادی کا شرف حاصل تھا۔ جون 1933ء میں بمقام علی گڑھ وفات پائی۔ دہلی میں اپنے خاندانی قبرستان 'مہدیون' میں سپرد خاک کیے گئے۔

مرزا عباس بیگ کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ صرف ایک صاحبزادی وجیہ النساء تھیں جن کا نکاح انھوں نے اپنے بھتیجے مرزا محمود بیگ (بن مرزا آغا شور بیگ) کے ساتھ کر دیا تھا۔ یہ نکاح سیتاپور ہی میں ہوا تھا جس میں مرزا غالب کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی مگر وہ اپنی خرابی صحت کی وجہ سے اس شادی میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ قدر بلگرامی کے خط میں جس تقریب شادی میں عدم شرکت پر اظہار افسوس کیا گیا ہے، وہ یہی تقریب تھی۔ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی (وجیہ النساء) کا اپنے باپ کے سامنے ہی (لاولد) انتقال ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں تعلقہ بڑا گاؤں (ضلع سیتاپور) اپنے ایک بھتیجے مرزا فیاض بیگ کو لکھ دیا تھا جن کی اولاد خاتمہ زمینداری کے وقت تک اس علاقے پر قابض رہی۔ مرزا عباس بیگ کی وفات بمقام لکھنؤ 1290ھ میں ہوئی۔ اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ (واقع قیصر باغ لکھنؤ) میں دفن کیے گئے۔ قدر بلگرامی نے تاریخ وفات لکھی ہے۔

ماہ جمادی الاول یکشنبہ دوم　　شب آفتابکے بہ زمیں پے فشردہ وائے

یعنی بہ مُرد ڈپٹی عباس بیگ خاں　　ہے ہے گلے بباغ امارت فسردہ وائے

1290 ہجری

برخواندہ قدر موبہ تاریخ ہجریش　　عباس بیگ خان بہادر بمردہ وائے

غالب کے یہ دونوں خطوط اسی اعتبار سے اہم نہیں ہیں کہ ان سے 'مکاتیب غالب' میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ خطوط اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان خطوط سے ان کی نجی اور خانگی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ غالب کی گھریلو زندگی کے جو گوشے اب تک تاریکی میں ہیں، یہ حقیقت بھی انہیں میں سے ایک ہے کہ غالب اور ان کے بھانجوں (مرزا عباس بیگ وغیرہ) میں وہ عزیزانہ و بزرگانہ ربط ضبط باقی نہیں رہا تھا جو ماموں بھانجوں میں ہونا چاہیے، پھر بھانجے بھی وہ جواُن کے سب کچھ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی بیوی کے بھانجے مرزا زین

العابدین خان عارف کو تو اپنا بیٹا بنالیا لیکن اپنی بہن کے پوتوں (نواب سرور جنگ، خداداد بیگ، رفیع الدین بیگ، محمود بیگ، ساجد بیگ وغیرہ) کو قطعاً نظر انداز کر دیا، جو ہر لحاظ سے ہونہار تھے۔ بظاہر تو مرزا اور ان کے بھانجوں میں کوئی نا اتفاقی نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں صفائی بھی نہیں تھی۔ رشتے کی نزاکت کی وجہ سے کبھی غالب نے اس سلسلے میں کوئی بات زبان سے نہیں نکالی۔ یوں بھی وہ صلح پسند آدمی تھے۔ پنشن کا مقدمہ جو اصل میں اس تمام جھگڑے کی جڑ تھا، ختم ہونے کے بعد انھوں نے اپنے حریف خاص خواجہ حاجی خان کے بیٹے بدر الدین عرف خواجہ امان سے نہ محض بگڑے ہوئے تعلقات استوار کر لیے بلکہ مواخاتی رشتے سے انہیں اپنا 'بھتیجا' بھی بنالیا جنہیں نسبی حیثیت سے غالب سے کسی قسم کا لگاؤ نہ تھا۔

اس گُپ چُپ، جھگڑے کی بنیاد دراصل "خاندانی پنشن" کا وہ مقدمہ تھا جس کے سلسلہ میں غالب کلکتہ گئے تھے۔ اس مقدمہ میں خواجہ حاجی خان نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ غالب کا ہم نسب بھائی ہے۔ غالب نے اس کے یک جدّی ہونے سے انکار کر دیا اور اصلیت بھی یہی تھی۔ لیکن خاندانی پنشن کا یہ مقدمہ غالب کے خلاف ہی ہوا، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خواجہ حاجی خان کے سالے جواد الدولہ [10] مرزا افضل بیگ برلاس اس زمانے میں بنگال ہی میں تھے۔ ان کا اثر ورسوخ ایسٹ انڈیا کمپنی میں بہت تھا۔ چنانچہ ان کی کوشش سے خواجہ حاجی خاں کو کامیابی ہوئی اور غالب کو شکست۔ غالب کو جواد الدولہ سے یہ شکایت تھی کہ جس طرح ان کی حقیقی بہن خواجہ حاجی خان کو منسوب تھیں، اسی طرح خود غالب کی بہن ان (جواد الدولہ) کے سگے بھائی مرزا اکبر بیگ بدخشی سے بیاہی گئی تھیں۔ دونوں کا پلہ برابر تھا اور غالب کی یہ خواہش کوئی بے جا بھی نہیں تھی کہ رشتوں کی اس نازک فضا میں جواد الدولہ کو غیر جانبدار رہنا چاہیے تھا۔ اگرچہ اس سلسلہ میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی ہے، لیکن قیاس یہی ہے کہ اس معاملے میں غالباً اکبر بیگ بدخشی کا رویہ بھی غالب کے لیے اطمینان بخش نہیں تھا۔ یہی گرہ تھی جو دلوں میں پڑ گئی اور پھر ان دونوں خاندانوں میں جیسی چاہیے صلح وصفائی نہیں ہو سکی، حالانکہ بظاہر کوئی لڑائی بھی نہیں تھی۔

حالات سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا عباس بیگ نے اپنے ماموں (غالب) کے دور ابتلا میں کبھی ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ انقلاب 1857ء کے بعد مرزا عباس بیگ کی مالی حالت بہت اچھی

ہوگئی تھی ۔ ان کا شمار اودھ کے امراء میں تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے بوڑھے ماموں کی پریشان حالی اور تنگ دستی میں انہیں کافی سہارا دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بھی وہ اتنے بارسوخ ہو چکے تھے کہ اگر غالب کا ساتھ دیتے تو ماضی کی تلخیاں یقیناً دور ہو جاتیں مگر کبھی ایسا نہیں ہوا۔

غالب نے اس خط میں اسی بات کا ہلکا سا شکوہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا عباس بیگ غالباً اپنے ماموں کے ہم عمر تھے۔ اور اگر چھوٹے بھی ہوں گے تو شاید دس پانچ سال سے زیادہ نہیں۔ بھائی مرزا عباس بہادر کا انداز تخاطب اسی بے تکلفی کی غمازی کرتا ہے۔ مرزا عباس بیگ کا انتقال غالب کی وفات (1285ھ) کے پانچ سال بعد (1290ھ) میں ہوا اور بوقت وفات ان کی عمر پچھتر اور اسی سال کے درمیان تھی۔ اس حساب سے بھی ماموں بھانجے کے فرقِ مراتب کے باوجود دونوں میں ہم سنی کا ارتباط کوئی خاص بات نہیں۔ ایک دوسری بات اس خط سے اور بھی ظاہر ہے کہ مرزا عباس بیگ 'سخنے اور قلمے' تو ان کے شریک حال تھے مگر جس سعی و کوشش کی ضرورت تھی، انھوں نے کبھی ایسی کوئی دلچسپی نہیں لی۔

پہلا خط:

بنام مرزا عباس بیگ مرحوم ابن مرزا اکبر بیگ بدخشی

''بھائی مرزا عباس بہادر...... میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کو کیونکر انجام دیتے ہو؟ اور مضامین قوانین کو کس طرح سمجھ لیتے ہو اور مقدمات مرجوعہ کس اسلوب سے فیصل کرتے ہو؟ مجھ کو نواب گورنر جنرل بہادر کا دربار کب نصیب ہوا۔ نہ انھوں نے دلی میں دربار کیا، نہ میں انبالی[11] گیا۔ میں نے تم کو لکھا کہ ادھر تو مجھ کو اپنے فرزند[12] کی شادی میں شریک نہ ہونے کا رنج رہا، ادھر دربار میں حاضر نہ ہونے کا غم رہا۔ اخبار میں میں نے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب یعنی جناب منٹ گمری (Montgomry) صاحب اور ان کے سکرتر (سکریٹری) تامس ڈگلس فورسائتھ (Thomas Dughs Forsythe)

صاحب اوران کے میر منشی [13] پنڈت من پھول سنگھ صاحب کی تعریف چھپوائی۔ اس اخبار کی عبارت سے یہ بات کب نکلتی ہے کہ منشی نے مجھے خلعت دلوایا۔ اور یہ بھی محل غور ہے کہ گورنر جنرل کے دربار میں خلعت پاتا، بہکتے ہو؟ اور پھر میر منشی من پھول سنگھ [14] ...... کو اس کا سبب جانتے ہو وہ میر منشی لفٹنٹ گورنر کے ہیں ،ان کو گورنر جنرل کی سرکار میں کیا دخل! مجھ کو ہرگز دیدار نواب گورنر جنرل لارڈ الگن (Lord Elgin) بہادر کا نصیب نہیں ہوا...... ہاں جب نواب لفٹنٹ گورنر منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا! بہت عنایت فرمائی اور ایک شال رومال سوزن کار اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی۔ یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے۔ مگر میری جان الجھی ہوئی ہے لارڈ صاحب کے دربار اور خلعت میں.......... فرمایا۔ اچھا اچھا، دوسرے دن لارڈ صاحب آئے [15] ...... تیسرے دن میں لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اساورے کے سات پارچے اور جغیہ سرپیچ بالائی مروارید تین رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اب میر ادربار اور خلعت بند ہے اس کا مجھ کو بڑا غم ہے۔ فرمایا کہ غم نہ کرو۔ تمہارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے! میں نے اپنا ہاتھ دکھایا اور کہا کہ حضرت بوڑھا ہوں اور زخمی ہوں۔ انبالے کس طرح جاؤں [16] ...... خیر آئندہ دربار میں پاؤ گے۔

جو عرضی انگریزی تم نے میری طرف سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی اور میں نے اپنی مہر کر کے رجسٹری کروا کے کلکتے بھیجی تھی، اس کا کچھ میں نے جواب کبھی نہیں پایا۔ شاید یہ حکم اسی عرضی پر ہوا ہو لیکن اس عرضی کو گئے ہوئے بہت دن ہوئے اور دربار اور خلعت کے واگزاشت کا حکم اب صادر ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی اظہار حسین خان میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمہارے دربار اور خلعت کے

واگزاشت کا حکم دے کر کلکتے سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ نواب گورنر جنرل بہادر کا نام لارڈ الگن بہادر ہے اور چیف سکرتر بہادر کا کرنیل ڈورنیڈھی بہادر'' نام ہے۔ ہارنگٹن (Harington) صاحب شاید سال آئندہ میں سکرتر ہوں یا پرائیویٹ سکرتر ہوں یا کونسل کے ممبر ہوں۔ بہر حال اگر تمہارے سبب سے یہ کام ہوا تو کیا غضب ہوا۔ مگر اتنا جان لو کہ واگزاشت کا حکم سنتا ہوں کہ ہوگیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی۔ یعنی نہ میں دربار میں گیا نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور امر ہے اور بات ہے۔ اس امر سے اور اس بات سے اس کو علاقہ نہیں۔

اب میں نے جناب کرنیل ڈورینڈھے بہادر چیف سکرتر کو فارسی خط بھیجا ہے۔ اور دو کاغذ انگریزی آمد ولایت اس خط کے ساتھ بھیجے ہیں، جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستوری مقرری جاری ہیں۔ دربار، خلعت، خط، بعد غدر کے یہ تینوں دستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگزاشت کی خبر سن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب کے آنے پر دل جمعی کا مدار ہے۔ اگر جواب آیا تو تم کو ضرور اطلاع دوں گا۔

واسطے خدا کے ان سطروں کو غور سے دیکھنا اور مطالب کو اچھی طرح سمجھ لینا اور غلط نہ سمجھنا۔ دوسرا ورق بنام محمود مرزا کے ہے، اس کو دینا اور اگر تمہارے پاس نہ ہو تو جہاں ہو بھیج دینا۔

راقم، غالب، مرقومہ صبح سہ شنبہ 23/ذی قعدہ 1229ھ

(مطابق 12/مئی 1863ء ضروری جواب طلب (صفحات 128/132

ماہنامہ خیابان لکھنؤ نومبر 1933ء)

اسی خط کا دوسرا حصہ، مرزا محمود بیگ کے نام ہے جو مرزا کے نواسے اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے اور داماد تھے۔ اس خط میں بھی ان کی شادی میں شریک نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے۔

''برخوردار اقبال نشان محمود مرزا کو دعا پہنچے۔

بھائی میں تمہارا خط دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خط تمہارا اچھا ہے۔

خدا کرے خط سرنوشت بھی اچھا ہو۔

خدا کی قسم تمہارے سہرے کے دیکھنے کی بہت خوشی تھی مگر نہ آسکا! اگر جیتا رہا اور اسباب نے مساعدت کی تو اکتوبر، نومبر یعنی جاڑوں میں آؤں گا اور تم لوگوں کو دیکھوں گا۔

پھوڑا اب اچھا ہو گیا ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ چھ مہینے کے دن رات کی ٹیس نے جو روح تحلیل کی ہے، اب بڑھاپے میں وہ پھر کہاں سے آئے۔ بیٹا تیرے سر کی قسم، اگر میں لنگ باندھے ہوئے ننگا بیٹھا ہوں تو میری شکل آکھ کے بڑھیا کی سی ہوگی۔ شاید ہوا کے جھونکے (سے) اڑ جاؤں۔ جب مجھ کو دیکھو گے تب جانو گے کہ کیا حال ہے۔

تمہارے چچا اللہ میاں کے ''مست خود پرست'' بندے ہیں۔ بات ہے کچھ، سمجھنے میں کچھ! نہ اخبار کا مطلب سمجھے نہ میرا حال، نہ میرا مقدمہ، نہ جو کچھ واقع ہوا اس کو سمجھے! اب میں نے ان کو ایک خط جداگانہ لکھا ہے۔ اپنی طرف سے اظہار حال میں کوئی دقیقہ نہیں رکھا۔ خدا کرے سمجھ جائیں۔ لیکن مجھ کو توقع نہیں کہ سمجھیں۔

تم نے اپنی والدہ کی اور اپنی بھاوج کی اور خداداد اور رفیع الدین کی خیر وعافیت [17] نہ لکھی۔ اب جو اس خط کا جواب لکھو تو ان سب کی خیر وعافیتیں لکھو۔

غالب، سہ شنبہ 22 ذی قعدہ، 12/ مئی سنہ حال

(صفحہ 132، ماہنامہ خیابان لکھنؤ ماہ نومبر 1933ء جلد 2، شمارہ 2)

ان دونوں خطوط سے غالب، ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ اور بھانجوں کی اولاد سے روکھے پھیکے تعلقات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مرزا عباس بیگ نرے کاروباری ہی آدمی نہیں تھے، خود شاعر تھے اور اچھا خاصا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ غالب کے نامور شاگرد میر غلام حسین

قدر بلگرامی ان کی تمام زندگی انہیں کی سرکار سے وابستہ رہے۔ جب مرزا عباس بیگ کا انتقال ہو گیا تو ان کے بھتیجے آغا مرزا بیگ (نواب سرور جنگ) نے ان کی سرپرستی کی اور حکومت نظام سے ماہانہ پنشن مقرر کرادی جو غالباً مرتے وقت تک قدؔر کو ملتی رہی۔ اس کے برعکس اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان لوگوں نے غالب کے برے وقت میں کبھی ان کا ساتھ دیا ہو۔ شاید اسی لیے یہ قریبی رشتے، رشتہ ہی کی حد تک رہے اور بس۔

(آج کل دہلی، فروری 1963ء)

حواشی

1. مرزا عباس بیگ کی کوٹھی کا بڑا حصہ امپرومنٹ اسکیم میں آ گیا تھا۔ اب اسی مقام پر ''کوتوالی قیصر باغ'' کی عمارت بنائی گئی ہے لیکن کوٹھی کا مشرقی حصہ اب بھی محفوظ ہے اور 'عباس منزل' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ کوتوالی قیصر باغ کے ملحق مرزا عباس بیگ کا امام باڑہ بھی اب تک محفوظ ہے۔ (نادم سیتاپوری)
2. دیکھیے مرزا کا خط قدر بلگرامی کے نام عوذ ہندی، اردوئے معلیٰ یا ادبی خطوط غالب مرتبہ محمد عسکری صاحب بی۔ اے (شہنشاہ حسین)
3. مرقومہ بالا واقعات کے قلمبند کرنے میں مرزا محمد عسکری صاحب مصنف ''ادبی خطوط غالب'' سے مدد لی گئی ہے۔ (شہنشاہ حسین)
4. سیّد شہنشاہ حسین مرحوم ایڈیٹر کی یہ معلومات صحیح نہیں ہیں کہ غالب نے قدر بلگرامی کے خط میں اپنے 'بھتیجے' کی شادی میں عدم شرکت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی ''وجیہہ النساء'' کی شادی میں شریک نہ ہونے پر اظہارِ معذرت کیا ہے۔ وجیہہ النساء رشتہ میں غالب کی نواسی ہوتی تھیں۔ اور مرزا محمود بیگ مرحوم بھی جن کے ساتھ وجیہہ النساء کا عقد ہوا تھا رشتہ میں غالب کے نواسے تھے یعنی ان کے بڑے بھانجے مرزا عاشور بیگ کے صاحبزادے۔ (نادم سیتاپوری)

5. نواب سید محمد ذکی علی خان ہاتف لکھنوی (عرف نواب بنن صاحب) لکھنؤ کے امراء میں تھے۔ پچاس سال سے زائد زمانہ گزرا جب ہاتفؔ نے لکھنؤ سے ایک مذہبی ماہنامہ 'تبصرہ' جاری کیا تھا جس کا پہلا شمارہ رجب المرجب 1327ھ میں شائع ہوا تھا یہ رسالہ انجمن ''مبشر الایمان''، لکھنؤ کا آرگن تھا اور عام مسلمانوں میں مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ (نادم سیتاپوری)

6. مرزا اکبر سید بدخشی کے خاندان کا مکمل شجرۂ غالب نامہ آدرم، مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ میں شامل ہے۔ (نادم سیتاپوری)

7. ملاں پور۔ شروع انگریزی میں اودھ کا ایک ضلع تھا۔ بعد میں اضلاع سیتاپور وکھیری میں ضم کردیا گیا۔

8. مرزا خداداد بیگ جن کی خیریت مرزا محمود بیگ کے خط میں غالب نے پوچھی ہے، بیرسٹر تھے غالباً لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے۔

9. مرزا محمود بیگ کے خط میں مرزا رفیع الدین بیگ (وحشی) کی بھی خیریت دریافت کی ہے۔ یہ بھی یو۔ پی میں کسی ممتاز عہدے پر مامور تھے۔ بعد میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ ان کا مختصر سا دیوان بھی چھپا ہے۔ جس کا مقدمہ مرزا امراؤ بیگ دہلوی نے لکھا ہے۔ یہ دیوان اب بالکل کمیاب ہے۔ (نادم سیتاپوری)

10. جواد الدولہ مرزا افضل بیگ برلاس مرزا جیون بیگ کے صاحبزادے تھے۔ ان کی حقیقی بہن خواجہ حاجی خان کو بیاہی گئی تھیں اور جواد الدولہ کے حقیقی بھائی مرزا اکبر بیگ بدخشی کو غالب کی بہن منسوب تھیں۔ جواد الدولہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کمپنی کی طرف سے بنگال کے ایک ممتاز عہدیدار تھے اور انگریزوں میں ان کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم چوتھی پشت میں انھیں جواد الدولہ کے پوتے تھے۔ جواد الدولہ کا نسب نامہ درج ذیل ہے۔

دادا سبز پوش

|

مرزا عاشور بیگ
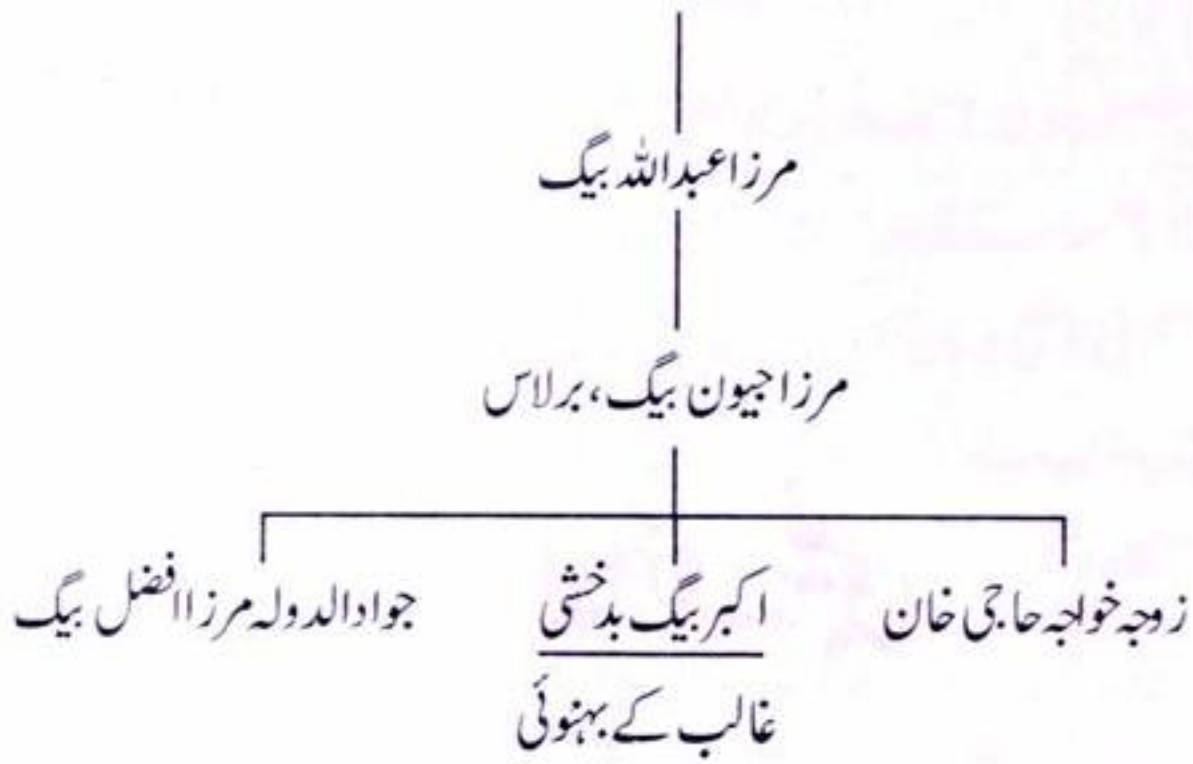
11. صحیح لفظ انبالہ ہے۔ خط میں انبالی لکھا ہے۔ (خیابان)
12. مرزا محمود بیگ کی شادی کی طرف اشارہ ہے جن کا نکاح مرزا عباس بیگ مکتوب الیہ کی صاجبزادی کے ساتھ اسی زمانے میں ہوا تھا۔ (نادم سیتاپوری)
13. پنڈت من پھول اپنے عہد کے بڑے پُراسرار آدمی تھے۔ 1865ء میں جنگ کریمیا کے سلسلے میں انگریزوں نے ڈاکٹر لائیٹر کی سرکردگی میں تاشقند و بخارا جو سیاسی مشن بھیجا تھا اس مشن میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے علاوہ پنڈت من پھول بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے بھیس بدل کر بہت دنوں تک اس روسی علاقے کی سیاحت کی اور بہت سے سیاسی راز حاصل کر کے انگریزوں کی مدد کی تھی۔ (نادم سیتاپوری)
14. یہاں پر متعدد الفاظ کاغذ کے کرم خوردہ ہونے سے اڑ گئے ہیں۔ (خیابان)
15. یہاں پر کاغذ کرم خوردہ ہے۔ (خیابان)
16. کاغذ کرم خوردہ ہے۔ (خیابان)
17. یہاں پر کاغذ اڑ گیا ہے۔ (خیابان)

لطائف غیبی

میر سعادت علی خاں نے قاطع برہان کا جواب 'محرق قاطع برہان' کے نام سے لکھا تھا۔ غالب نے اول تو ایک رسالہ کسی نام کے بغیر عبدالکریم کی طرف سے ان کے خلاف لکھا، جسے اپنے ایک خط میں انھوں نے 'سوالات عبدالکریم' کہا ہے اس کے بعد انھوں نے ایک ضخیم تر رسالہ سیاح کی طرف سے بنام ''لطائف غیبی'' تحریر کیا اور اسے دہلی کے اکمل المطابع میں 1281ھ میں چھپوایا۔ دوسروں نے اس سے مفصل بحث کی ہے کہ یہ غالب کی تصنیف کیوں قرار دیا جاتا ہے اور چونکہ اس پر غالب شناسوں کا اتفاق ہے، اس کے متعلق کچھ اور لکھنا غیر ضروری ہے۔ اس مقالے میں یہ دکھایا جائے گا کہ اس رسالے میں غالب کا لہجہ اور استدلال کیسا ہے، اور'' محرق قاطع برہان'' کے مطالب سے کس حد تک انھوں نے تعرض کیا ہے۔

غالب خود اپنی نسبت تحریر فرماتے ہیں

(1) ''اللہ اللہ غالب نام آور نامدار، کوئی شہر ایسا نہ دیکھا جس میں ان کے دو چار شاگرد، دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں۔ ایک عالم ان کی فارسی دانی اور شیوا بیانی کا معترف، نظم میں ظہوری و نظیری و عرفی کے برابر، نثر میں نثاران سابق و حال سے بہتر'' (لطائف غیبی صفحہ 2، 3) (2) ''باوجود صفت امامت صاحب کمال یگانۂ روزگار اہل ہندوستان کا مطاع، مسائل منطق فارسی کا مفتی...... طرز بیان میں ایک عالم اس کا معتقد'' (لطائف غیبی صفحہ 5) (3) ''آج انشا و انشا کے مجموع فنون میں ایک آیت ہے آیات الٰہی میں سے'' (صفحہ 33) (4) ''محقق

ومدقق'' صفحہ 34 (5) ''ہمہ دان عدیم النظیر'' صفحہ 12 (6) ''محقق اکمل'' صفحہ 12، (7) ''صاحب کمال عدیم المثال'' صفحہ 12۔''

مصنف ''محرق قاطع برہان'' اس کا نام غالب نے تپ (کذا) محرق رکھا تھا، کے بارے میں لطائف غیبی میں غالب نے جو گل افشانیاں کی ہیں، ان کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

(۱) ''ظاہرا منشی جی بطن مادر سے پڑھے لکھے روبکاریاں لکھتے ہوئے نکلے ہیں۔ سیف الحق سُن، یہ بات نہیں ہے جانے گا تو اگر سمجھنے والا ہے، یہاں کچھ دال میں کالا ہے۔ منشی جی ...... ''اقتضاء المرء یقیس علی نفسہ'' سے مجبور ہیں۔ جس طرح منشی جی پر استاد سے فتح باب ہوا (کذا) ہے، جانتے ہیں کہ ہر شاگرد اپنے استاد سے اسی طرح فیض یاب ہوا ہے۔'' (صفحہ 3)

(2) ''ہمارے منشی صاحب از روئے علم وفن منشی نہیں ہیں۔ از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں جیسے منشی بھیروں ناتھ اور منشی گینڈا مل۔'' (صفحہ 4)

(3) ''صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیجڑا تالیاں بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے وہ فحش بک رہا ہے۔'' (صفحہ 4،5)

(4) ''ظاہرا اس سے باطنی استفادہ ہے۔ گاہ گاہ خواب میں آیا کرتا ہوگا اور منشی جی کو رگڑے جھگڑے بتایا کرتا ہوگا۔ ان کو فارسی داں کیا ہے، علم کا نلوا اُتار دیا ہے، یا یوں ہے کہ جامع برہان قاطع مر کر بھوت بن گیا ہے اور صاحب تپ محرق...... پر آچڑھا ہے۔ بھلا صاحب، جب دکنی طالب اور منشی جی مطلوب، وہ محب اور یہ محبوب ہیں تو چاہیے کہ از روئے ناز و کرشمہ جوتی پیزار گالی گلوت (کذا) سے اس کو رجھائیں، اوروں نے کیا گناہ کیا ہے کہ ان کو بھوگ سنائیں۔ منشی جی کو میں نے دیکھا نہیں جو کہوں کہ گورے ہیں یا کالے ہیں۔ ان کی تحریر سے اسی قدر پایا جاتا ہے کہ سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں۔'' (صفحہ 5،6)

(5) ''منشی جی کہیں سے فرہنگ رشیدی اٹھا لائے ہیں اور حمام واستحمام وچادر

ومادر[1] کو دکھلا رہے ہیں۔'' (صفحہ 6)

(6) ''دکنی استاد اور منشی شاگرد ہے اور یہ بھی متفق علیہ جمہور ہے کہ شاگرد بیٹے کی جگہ اور استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔'' (صفحہ 7)

(7) ''دیکھو منشی جی لعنۃ اللہ علی الکافرین[2] (کذا) اور لعنۃ اللہ علی الکاذبین[3] (کذا) کا تازیانہ...... غالب پر تہمت رکھنے والوں کی ...... برابر کھال اڑا رہا ہے۔ او سیف الحق سیاح تو کیا کہہ رہا ہے، منشی جی کو کلام الٰہی سے کیا علاقہ، وہ جانیں اور مسلمہ (کذا) کذاب یعنی ...... جامع برہان قاطع۔'' (صفحہ 7)

(8) ''آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو۔'' (15)

(9) ''منشی پاگل'' (صفحہ 19)

(10) ''بے حیا'' (صفحہ 22)

(11) ''منشی جی زن حائضہ...... کے پیچھے پڑے ہیں۔'' (صفحہ 27)

(12) ''مقدمات علمی میں منشی جی کا دخل بعینہ ایسا ہے جیسا مسموعات میں بندر کا شطرنج کھیلنا اور مشاہدات میں بندریا کا ناچنا۔'' (صفحہ 20)

(13) ''ہم نے منشی جی کی فارسی کو چغدی ٹھہرایا، عقلا سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم نے ان کو کیا بنایا۔'' (صفحہ 21)

(14) ''منشی جی کا حسن ظن بھونڈا ہے۔ فحول علما میں ان کا حسن ظن کسی کو پسند نہ آئے گا۔'' (صفحہ 28)

(15) ''منشی جی کو از روئے والد ماجد ایک اور باپ والد حقیقی سے بڑا بہم پہنچانا ہوگا۔'' (صفحہ 28)

(16) ''اور یہ جو فرماتے ہیں کہ کرامت نام کنیز بود۔ ہے ہے منشی جی بھول گئے فراز کی بحث میں دیکھیں کہ حضرت گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھے تھے جب راجہ

اندر کا اکھاڑہ آسمان پر سے آپ کے گھر میں اتر آیا تھا تو آپ نے اسی لونڈی کو فرمایا تھا کہ کرامت جلد اٹھ اور دروازہ کھول ...... اس میں کیسا لطف ایہام ہے۔'' (صفحہ 29)۔

(17) ''منشی جی...... ظرفا کے تو نور بصر اور راحت جاں ہیں۔'' (صفحہ 29)

(18) ''دوسُدّ ے...... ان کے منہ سے نکلے مادّہ محتبس دفع ہوگیا۔'' (صفحہ 29)

(19) ''جرأت کے مخمس کا ایک بند...... بحسب مناسبت مقام لکھ دیا جاتا ہے۔''

''دیا سلائی جو بیچے تھے یا کہ سرکنڈا　　ہوئے وہ صاحب لشکر بنا کے اک جھنڈا

ہوائے باغ جہاں سے نہ کیوں ہو دل ٹھنڈا　　کہ ٹینی مرغی کا بچہ کھٹکتے ہی انڈا

حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی'' (صفحہ 33)

(20) ''باعتبار فقدان علم و ادب نیم آدمی'' (صفحہ 35)

(21) ''تماشے کی بات ہے، یہ پیر نابالغ جس لغت یا جس ترکیب کو آپ نہیں جانتا، اس...... کی موجودیت کا قائل نہیں۔'' (صفحہ 36، 37)

(22) ''منشی جی بیدُم ہیں، مَن...... دُم کے ساتھ آتا تو...... دُمدار بن جاتے۔'' (صفحہ 39)

اب استدلال کا نمونہ دیکھیے:

(1) ''جامع برہان قاطع لکھتا ہے ''آویزہ...... گوشوارہ را گویند'' یہ تقریر اس کے مخبط ہے کہ آویزہ کو بانفراد گوشوارہ لکھا، حال آنکہ آویزہ مخصوص بگوش نہیں، تاج و چتر و کلاہ بلکہ ہاتی (کذا) کی جھول اور گھوڑے کے زین پوش میں بھی لگاتے ہیں۔ خان غالب لکھتے ہیں ''حاشا کہ آویزہ و گوشوارہ یکے تواند بود'' اس ادعا کو کون غلط کہہ سکتا ہے؟ واقعی آویزہ و گوشوارہ ایک چیز نہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک، مگر آگے نجم الدولہ بہادر (یعنی غالب) لکھتے ہیں کہ:

''گوشوارہ چیزیست زرنگار یا مرصع بجواہر آبدار کہ بر دستار بچپند و آویزہ پیرایہ ایست کہ در نرمہ گوش سوراخ کنند و آں آویزند تا آویزاں باشد۔ قصد اچھا،

بیان قصد کے خلاف ہے۔ چاہیے تھا کہ ''آویزہ'' کی تخصیص مٹاتے، اوراس کی تعمیم میں کلام کرتے نہ کہ گوشوارہ کے معنی اصلی چھوڑ کر گوشوارۂ اصطلاحی کا ذکر کیا اور آویزہ کے معرّف اس نہج پر ہوئے کہ دیکھنے والا گمان کرے کہ شاید زیور گوش ہے بالتخصیص۔ خدا کی قدرت، ایسا صاحب کمال عدیم المثال ایک سہل تقریر میں دو مغالطے کھائے۔ ہاں انسان جائز الخطا ہے، خصوصاً ستر برس کا آدمی...... حضرت غالب کے حسن تحریر پر...... کسی کی نظر لگی، چلو اچھا ہوا کہ ایسے ہمہ داں عدیم النظیر سے ہزار بات میں دو باتیں ایسی بھی ہوئیں کہ جس (کذا) سے منشی جی کا دل خوش ہوا اور یقین ہے کہ...... دکنی کی روح بھی خوش ہوئی ہوگی۔

''دوسرا مغالطہ جو اس محقق اکمل کو واقع ہوا ہے، وہ یہ ہے: اسف کے مشتقات کو افسوس کے مشتقات میں بھی لکھا ہے۔ یہ سہو طبیعت ہے، قصور فہم نہیں ہے، اکابر امت کو مسائل فقہ اور مناظرۂ فن کلام میں ایسے سہو واقع ہوئے ہیں۔ علامہ تفتازانی کو سید جرجانی سے مقولۂ علم میں تادیر سکوت رہا ہے اور صاحب ''متن کیدانی''...... نے ''سبابہ فی التحیات'' کو یا آنکہ مسنون ہے، محرمات صلوٰۃ میں لکھا ہے، نہ اس سکوت سے علامہ تفتازانی کی تحمیق لازم آتی ہے، نہ اس بیان سے صاحب متن کیدانی کی تکفیر ہو سکتی ہے۔ شعرا کے اشعار میں اور بلغا کے عبارات میں...... بہت ایسے سہو خلل پائے جائیں گے۔ سعدی:

همره اگر شتاب کند همره تو نیست   دل در کسی مبند که دل بستهٔ تو نیست

مولوی جامی

برود ایں دامِ برمرغِ دگر نہ   کہ عنقا را بلنداست آشیانہ

ان دونوں شعروں میں ہائے اصلی وہائے مختفی کا قافیہ، خواجہ حافظ......

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا   ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

اس شعر میں روی متحرک قافیہ نصیب اعدا۔ سیف الحق کا مقصود یہ ہے کہ یہ جو مولانا غالب کو دو سہو واقع ہوئے ہیں اسی قبیل سے ہیں۔ جیسے ان بزرگوں

کو عارض ہوئے ہیں اور یہ ماہرین فن کے نزدیک سہو طبیعت ہے۔ یہ بات جو
از الزام واعتراض کی حجت نہیں ہو سکتی۔ معہٰذا غالب کا بیان ہے کہ "جامع
برہان قاطع" نے افسوس بروزن مینوش اور فسوس بروزن عروس کو لغت واحد سمجھا
ہے اور یہ خطا ہے۔ افسوس بمعنی دریغ وحسرت جداگانہ لغت اور فسوس بمعنی استہزا
جداگانہ لغت ہے۔ اور یہ جو نواب صاحب افسوس کو لغت عربی لکھ گئے ہیں سہو
طبیعت ہے۔ عربی نہ سہی، فارسی سہی، لیکن دکنی کا بدستور حمق ثابت رہا کہ اس
نے افسوس و فسوس کا تفرقہ ملحوظ نہ رکھا۔" (صفحہ 11 تا 13)

مناظرے کا مقصد کسی معاملے کے متعلق حقیقت کا معلوم کرنا ہے، جو فریق غلطی پر ہے اس کا فرض ہے کہ جس وقت اسے اس کا احساس ہو جائے، فوراً بے تامل اس کا اقرار کرے۔ اسے اس کا رنج ہو کہ اس سے غلطی کیوں سرزد ہوئی تو بیجا نہیں، لیکن فضول تاویلات سے اس کی اہمیت کو گھٹا کر دکھانے کی کوشش نامناسب ہے۔ ڈاکٹر جونسن کا انگریزی لغت شائع ہوا تو ایک خاتون نے اس میں ایک غلطی نکالی، اور مولف سے اس کا ذکر کیا، وہ سمجھتی تھی کو مولف کو غلطی پر اصرار ہوگا یا شرح وبسط سے یہ بتائے گا کہ اس کا ارتکاب کیونکر ہوا، لیکن ڈاکٹر جونسن نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ غلطی کی وجہ محض ناواقفیت تھی۔ غالب کا رویہ بالکل جداگانہ ہے۔

(الف) غالب بقول خود رجب 1212ھ میں پیدا ہوئے تھے اور جیسا کہ دیباچۂ قاطع برہان میں ہے، اس کا آغاز 1273ھ اور انجام 1276ھ میں ہوا تھا۔ وہ 73ء میں 61 اور 76ء میں 64 برس کے تھے۔ لطائف غیبی میں انھیں یہ لکھنے کا حق نہ تھا کہ "انسان جائز الخطا ہے، خصوصاً ستر برس کا آدمی۔"

(ب) قاطع برہان جیسا کہ خود غالب نے ایک خط میں بتایا ہے، سرسری طور پر نہیں لکھی گئی تھی۔ اس میں بار بار کاٹ چھانٹ ہوئی تھی۔ پہلے اس کے مطالب برہان قاطع کے حاشیے پر سپرد قلم ہوئے تھے، بعد کو یہ مطالب کتابی شکل میں آئے اور مسودے میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی۔ انطباع سے پیشتر اس کے کئی قلمی نسخے بھی (ظاہراً) غالب نے لوگوں کو دیے تھے۔ آویزہ اور افسوس کے متعلق قاطع برہان مطبوعہ میں جو کچھ مرقوم ہے، وہ سوچی سمجھی ہوئی بات ہے اور ایک

مدت کی غور وفکر کا نتیجہ، اسے سہو طبیعت کہنا غلطی کی اہمیت کو کم کرنے کی ناجائز کوشش ہے۔

(ج) ''متن کیدانی'' کو ابھی میں نے نہیں دیکھا، اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی اس کے مصنف کے قلم سے وہ بات جو غالب نے اس سے منسوب کی ہے نکلی ہے یا نہیں، اور کوئی غلطی اس سے سرزد ہوئی تو اس کی وجہ کیا ہے۔ تفتازانی اگر واقعی کسی بحث میں تادیر ساکت رہے، تو ان کی زبان سے کوئی غلط بات نہ نکلی، خاموشی یا تو اس وجہ سے تھی کہ وقتی طور پر ان کے حافظے نے کام نہ دیا، یا اس سبب سے کہ مسئلہ زیر بحث کے متعلق ان کا علم محدود تھا۔ یہ امور غالب کے دائرۂ معلومات سے بالکل باہر ہیں، اور انہیں ان کا مطلقاً ذکر نہ کرنا تھا۔ رہے اشعار، تو شعر سعدی میں جس نوع کے قوافی آئے ہیں، فرخی وغیرہ کے یہاں بھی ہیں اور غالب نے ان کی تقلید کی ہے۔ یہ بات باور کرنے کی نہیں کہ سعدی فن قافیہ سے ناواقف تھے۔ جامی کی طرف جو شعر منسوب ہے، وہ غزل کا شعر افتتاحی نہیں، اور اس میں نہ بطور قافیہ نہیں آیا۔ غزل کے قوافی آشیانہ کے علاوہ چغانہ شبانہ وغیرہ ہیں۔ غزل جامی کی ہے بھی نہیں، حافظ کی ہے اور ان کے دیوان مطبوعہ میں موجود ہے۔ وہ شعر جس کی ردیف 'کجا' ہے البتہ حافظ کا ہے اور اس میں بیشک غلطی ہے۔ لیکن غلطی اتنی معمولی ہے کہ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ حافظ کو اس کا علم نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ غلطی کے احساس کے باوجود انھوں نے مصرع ثانی کی برجستگی کی بنا پر اسے رہنے دیا۔ یہ سہو نہیں۔ ان اشعار سے بھی غالب کو یہ یقین دلانے میں کہ غالب کی غلطیاں محض سہو پر مبنی اور نظر انداز کیے جانے کے قابل ہیں، زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔

(د) ''سہو طبیعت یہ ہے کہ خلاف ارادہ کوئی بات قلم سے نکل جائے، یا یہ کہ وقتی طور پر فراموش ہو جائے یا حافظہ اس میں تصرف کر دے۔ غالب سے افسوس اور فسوس کے معاملے میں بڑی فاحش غلطی ہوئی تھی، اسے سہو طبیعت نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ غلطی اہم ہو یا غیر اہم، فریق کو اس پر اعتراض کا پورا حق حاصل ہے۔ دوسرے لوگ البتہ اس کا خیال کریں گے کہ غلطی کی نوعیت کیا ہے اور کیونکر اس کا ارتکاب ہوا۔

(ہ) آویزہ وگوشوارہ کی بحث نقد غالب ص 487 تا ص 488 میں ملاحظہ ہو۔ افسوس وفسوس کے بارے میں نقد غالب میں جو کچھ مرقوم ہے وہ صفحہ 442 تا 452 میں آیا ہے۔ افسوس وفسوس

ایک ہی ہیں۔ اصلی لفظ جو پہلوی میں بھی ہے، افسوس ہے۔ فارسی میں افسوس بھی رہا اور فسوس بہ تخفیف بھی آیا۔ ان دونوں کے معانی میں جہاں تک فارسی کا تعلق ہے، یک قلم فرق نہیں۔ پہلے افسوس صرف استہزا اور مماثل کے لیے آتا تھا، بعد کو رنج وغیرہ کے معنی میں بھی مستعمل ہونے لگا۔ چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

بلعمی کی ''تاریخ طبری''[5] (عہد سامانی) میں ہے:

''آن قوم بروئے خندیدند وافسوس کردند''

شاہنامہ فردوسی[6] میں ہے:

بخندید وانگہ بافسوس گفت　　　که ترکان زایران نیابند جفت

بوستان سعدی[7] میں ہے:

اگر شوخ چشمی وسالوس کرد　　　الا تا نپنداری افسوس کرد

لباب الالباب (حصہ ایک، صفحہ 200) میں حمید الدین کا شعر ہے:

فسوس زیر رکاب شما کمیت وسمند　　　دریغ بر سر فرق شما قباد کلاہ

لباب الالباب حصہ 2 (صفحہ 134) میں نوری کا مصرع ہے:

آسماں ہر ساعتے گوید کہ آوخ اے فسوس

غالب کے ایرانی معاصر ہدایت کا مصرع مجمع الفصحا حصہ 2، صفحہ 605 میں ہے:

''اے فسوسا عزیز چون شد خوار''

غالب کا افسوس کو عربی کہنا اور تاسف ومتاسف ووا اسفاہ کو افسوس کے متخرجات بتانا اصول اشتقاق سے کامل بے خبری پر مشعر ہے۔ ایسی غلطی تو صرف عربی کے مبتدی سے بھی نہیں ہو سکتی۔ غالب کا یہ قول کہ برہان کا افسوس وفسوس کے معانی کو ایک کہنا اس کے حمق پر دال ہے، صحیح نہیں۔ اگر فی الواقع اس سے غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو یہ حماقت نہیں، کم علمی پر مبنی ہوتی۔ غالب کا ایسی فاحش غلطی کے ارتکاب کے بعد برہان کے حمق پر اصرار، کیا کہا جائے کہ کیا ہے۔

(2) 70 صفحے میں حضرت غالب کی عبارت لکھ کر منشی اس کا مجیب ہوتا ہے، عبارت یہ ہے:

اکنوں در دبستان مذاہب میگرم کہ یشتن ویشتہ بختانی نوشتہ اند، حاشا کہ

رقم سنج دبستان مذاہب کہ گرانمایہ ایست بغوامض دین زردشتیاں...... دریں
منطق خطا کند و پشتن رایشتن بیای حطی نگارد۔ اتفاق کارواں کارواں
کاتباںست برغلط نوشتن، نگرندگان مشاہدہ راشاہد گرفتند، وہم برین جادہ رفتند۔

اب یہاں ایک نشاط انگیز بات سنئے: منشی جی صفحہ 71 کی 8 سطر میں لکھتے ہیں کہ:

"مرزا اسداللہ غالب مینگارد کہ اکنوں در دبستان مذاہب مینگرم کہ
یشتن ویشتہ بیای تحتانی درست و بجا۔"

یارب یہ حمق مجسم و کذب مصور کیا لکھتا ہے، یہ وہی مثل ہے کہ من چہ میگویم[8] و قنبر من چہ میگوید۔

حضرت غالب کب لکھتے ہیں کہ درست و بجا، بلکہ لکھتے ہیں کہ...... "کاتبوں کی غلط نویسی ہے"...... بعد اس دُھرپت کے ایک ٹھمری یہ گاتے ہیں کہ "صاحب برہان قاطع رقم میزند کہ پوزیدن بمعنی عذر آوردنست۔ لو صاحب، یہ منشی جی کی تحریر تو میرے مفید مطلب ہے۔ فی الحقیقت پشتن ببای فارسی مصدر اور پوزد مضارع اور پوزدن مصدر مضارعی اور پوزیدن مزید علیہ جیسے آوردن اور آوریدن۔ یشتن بیای حطی سہو کتابت ہے اور مستند (کذا) سہو کاتب ہونا حماقت۔ پھر اسی صفحے میں منشی جی کا ماحصل تقریر یہ ہے کہ رشیدی پوزش کو بمعنی عذر اور میپوزد کو بمعنی عذر میکند لکھتا ہے۔ پس از روئے فرہنگ رشیدی بھی پوزش ومی پوزد کا وجود متحقق ہوگیا۔ اللہ ری فقدان قوت عاقلہ اور انعدام قوت منفعلہ کہ لکھتا ہے کہ پوزدن و پزدن کہیں نظر نہیں آیا۔ کوئی پوچھے کہ دیکھ دکنی بھی پوزیدن بمعنی عذر آوردن لکھتا ہے، اور واقعی جب پوزیدن نہ ہو تو پوزد کس کا مضارع ٹھہرے۔ اور جب پوزد نہ ہو، تو میپوزد کہاں سے آجائے؟ اصل مصدر پشتن، اس کے مضارع میں سے پوزیدن پیدا ہوا، پوزدن اسکا مخفف، جیسے پرداختن......اور پردختن...... ہم پوچھتے ہیں کہ پوزیدن و پوزش کے منشی جی قائل ہیں، پس یہ فرمائیں کہ اگر پشتن ببای فارسی مضموم اصل مصدر نہیں تو پوزد کس کا مضارع اور پوزن کیونکر بنا۔ جب منشی جی کے نزدیک یشتن بتحتانی صحیح ہے تو اس میں سے یوزد اور یزش بتحتانی پیدا ہوگا، نہ کہ پوزد اور پوزش ببای فارسی" صفحہ 35، صفحہ 36۔

غالب نے قاطع برہان میں لکھا ہے:

''پوشتن ...... وپشتن ...... مصدر یست پارسی (کذا) الاصل ...... مضارع ...... پوزد پزد، ہرآئینہ مصدر مضارعی نیز د وگونہ می توان ساخت پوزیدن وپزیدن ، امابمعنی این ہرچہار۔ دعا خواندن وبرآب وشربت دمیدنست وانچنیں دعارا ...... دروں گویند ...... وچیزی مادرون برآن دمیدہ باشند پوشتہ وپشتہ وپوزدہ وپزدہ گویند وپوزش وپزش حاصل بالمصدر پوزیدن وپزیدن است کہ مجازاً بمعنی عذر داستعذ ارآید۔'' اس کے بعد وہ عبارت جو لطائف غیبی میں ہے: ''اکنوں ...... رفتند'' غالب نے قاطع برہان میں یا کہیں اور اس دعوے کا کہ پشتن (بیا) دراصل پشتن (بیای فارسی) ہے، اس کے سوا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا کہ عبدالصمد یہ کہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فریق کا اطمینان اس سے کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

میں نے پشتن وپشتن سے اپنے مقالے متعلق عبدالصمد میں جو احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد شامل ہے، بحث کی ہے، اور پوزش کی حقیقت نقد غالب صفحہ 355 میں لکھی ہے، پشتن ببای فارسی کوئی لفظ نہیں، ظاہر ہے کہ یہ نہیں تو کوئی لفظ اس سے متخرج بھی نہیں ہوسکتا۔ پوزیدن کے معنی عذر کرنا ہے، استعذار نہیں۔ اس کے اور پشتن کے معانی میں بہت فرق ہے، دونوں کو ایک سمجھنا خواہ پشتن پشتن ہی کیوں نہ ہو، خطائے فاحش ہے۔

پوشتن وپوشتہ پوزدن، پوزدہ، پزدہ، پزش وجود خارجی سے محروم ہیں۔ پوزیدن کے وجود سے پوشتن کی ہستی ثابت نہیں ہوسکتی۔ اگر ہوسکتی تو سزیدن کے ہونے سے یہ لازم آتا کہ مشتن بھی ہے۔ اصل یہ ہے کہ فارسی میں مصادر کی کئی شکلیں ہیں، کچھ مصدر تن یا ستن پر ختم ہوتے ہیں، کچھ دَن اور یدن پر، کچھ ریشوں سے ایک سے زیادہ مصدر بنتے ہیں جیسے گستردن اور گستریدن گستر سے، آوردن وآوریدن آور سے۔ اس کا مدار محض سماعت پر ہے۔ مصدر مضارعی کہنا صحیح نہیں، اس لیے کہ اسے فرع سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، لیکن جو لوگ، مصدر مضارعی کو بطور اصطلاح استعمال کرتے ہیں، ان کی مراد اس سے وہ مصادر ہوتے ہیں، جن کے ریشوں سے دو مصدر موجود ہوتے ہیں، ایک کچھ اور طرح ختم ہوتا ہے اور ایک کے آخر میں یدن آتا ہے۔ اس کا اور سابق الذکر کے مصدر کا حرف ماضی مختلف ہوتا ہے، باقی صیغے ایک ہوتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں گستریدن اور آوریدن مصدر مضارعی نہ ٹھہرتا بلکہ پوزیدن مصدر مضارعی سمجھا جاتا۔ غالب نے الٹی گنگا بہائی

ہے۔ یزش (بالیا) حاصل مصدر یشتن واقعی موجود ہے، بلکہ یزش و پوزش دونوں ایک شعر میں جو بہرام، پژدو (زردشتی معاصر سعدی) کا ہے، آئے ہیں، اگر یزش کی جگہ پزش ہوتا تو پوزش کے ساتھ اس کا لانا محض حماقت ہوتی۔

ہمہ قوماں یزش کردند پوزش | بہ پیش دادگر زاری وخواہش

غالب نے بہت سی باتوں سے بحث نہیں کی۔ اس طرح ٹال دیا ہے: ''اس بحث میں نوع کا پتا دے کر منشی جی جامن کھانے چلے گئے، اور آلوسیہ کا جھگڑا نکالا، مجھ کو آلوسیہ میں اُلوسیہ کی صورت نظر آئی۔ متزجر (کذا) متنفر ہو کر بھاگا۔'' (صفحہ 11)

لطائف غیبی علمی نقطہ نظر سے فضول سا رسالہ ہے، بعض مقامات میں ظرافت کے اچھے نمونے اس میں البتہ ملتے ہیں۔

حواشی

1. قاطع برہان میں ہے (دربارۂ آدر): ''بروزن مادر چرا گفت؟ چادر را گذاشتن و مادر را آوردن بیجائیست۔''
2. قرآن میں ک پر چھوٹا الف۔
3. قرآن میں ک پر چھوٹا الف۔
4. ظن اور 'زن' (یہ عورت) کا تلفظ اُردو میں ایک ہے، فحول فحل (یہ نر) کی جمع ہے۔
5. بلعمی نے بھی محمد بن جریر کی تاریخ طبری (عربی) پر مبنی فارسی میں تاریخ لکھی تھی جو بلعمی کی تاریخ طبری کے نام سے موسوم ہے۔ ایڈیٹر
6. مطبوعہ نول کشور پریس 1884ء۔
7. مشمولہ کلیات سعدی طبع بمبئی 1267ھ۔
8. مطابق غلط نامۂ لطائف غیبی۔ میں نے قنبر کی جگہ طنبور سنا ہے، قنبر کے معنی یہاں پر کیا ہیں؟ اگر کسی صاحب کی سمجھ میں آئے تو مجھے مطلع فرمائیں۔ عبدالودود

مالک رام

غالب کے ادبی معرکے

غالب دسمبر 1797ء میں پیدا ہوئے اور فروری 1869ء میں انھوں نے رحلت کی۔ اگر اس 71 سال سے کچھ اوپر عرصے کے واقعات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی پوری زندگی معرکوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ان میں ہر طرح کے معرکے تھے۔ خاندانی معرکے، مالی معرکے، جذباتی معرکے، اور ان سب سے اہم تر ادبی معرکے۔ یہاں انھیں آخری قسم کے معرکوں کا کچھ بیان مقصود ہے۔ بیشتر دوسرے معرکے محدود مدت کے تھے یا ان کے اثرات عارضی تھے، لیکن ادبی معرکے ان کی پوری زندگی کو محیط ہیں۔

1۔ مولوی محمد معظم سے چپقلش

ان کا سب سے پہلا ادبی معرکہ اپنے مکتب کے استاد مولوی محمد معظم سے آگرے میں پیش آیا، جب ان کی عمر دس گیارہ برس وسیع تر سے زیادہ نہیں تھی۔

غالب کے زمانے میں مکتبوں کے نصاب میں فارسی اور عربی کا دور دورہ تھا۔ عربی پر کم اور فارسی پر زیادہ توجہ تھی۔ عربی میں بالعموم قرآن ناظرہ اور صرف ونحو کی تعلیم لازم تھی۔ اس کے مقابلے میں فارسی کا نصاب وسیع تر تھا۔ اگر طالب علم واقعی پڑھنے کا شوقین تھا اور اس کا ذہن اخاذ ہوتا تو پانچ سات برس میں وہ فارسی کے کلاسیکی ادب کا بیشتر حصہ پڑھ لیتا تھا۔ غالب کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ عربی میں وہ بمشکل مایۂ عامل ہی تک پہنچے۔ لیکن انہیں فارسی ادب سے فی الجملہ مزاولت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اس ابتدائی زمانے میں ان کی ایک فارسی غزل کا پتا ملتا ہے، جس

میں انھوں نے ردیف میں، ''کہ چہ'' کی جگہ ''یعنی چہ'' لکھا تھا۔ پورا واقعہ حالی کی زبان سے سنیے: لکھتے ہیں[1]:

''(غالب) نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے، گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کیے تھے، جن کی ردیف میں ''کہ چہ'' بجائے ''یعنی چہ'' کے استعمال کیا گیا تھا۔ جب انھوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو انھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے۔ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر نظر پڑ گیا۔ جس کے آخر میں ''کہ چہ'' ''یعنی چہ'' کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران ہوئے اور مرزا سے کہا: تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکر شعر کیا کرو، اور کسی کے اعتراض کی پروا نہ کرو۔

ملا ظہوری کے دیوان میں دو غزلیں ایسی ہیں جن کی ردیف کہ چہ ہے[2]۔ اس ہلکی چپقلش میں غالب کامیاب رہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے اور اس سے کس نتیجے کی توقع ہو سکتی ہے۔

2۔ شعرائے دلّی سے چھیڑ چھاڑ

غالب 1228ھ (1812-1813ء) میں ملا عبدالصمد کو ساتھ لے کر آگرے سے دلی آئے۔ اس وقت ان کی عمر 15-16 برس کی تھی۔ شاعری وہ قیام آگرہ کے زمانے ہی میں شروع کر چکے تھے اور اگر چہ جیسا کہ آپ نے دیکھا، اس زمانے کی کم از کم ایک فارسی غزل کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے آغاز اردو ہی سے کیا تھا۔ چونکہ تعلیم کے دوران میں فارسی ادب کا مطالعہ بڑے وسیع پیمانے پر کیا تھا، اس لیے ان کا فارسی شعرا سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ جیسا کہ انھوں

نے خود ایک خط میں لکھا ہے [3]۔ وہ جب شعر کہنے لگے تو بیدل اور شوکت اور اسیران کے محبوب شاعر تھے۔ اسی زمانے کا شعر ہے:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

ان اساتذہ کے تتبع کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی شاعری مضمون آفرینی کی دھن میں کوہ کندن وکاہ برآوردن کا نمونہ بن گئی۔ قدرتی بات تھی، سننے والے اس سے بھڑکے اور انھوں نے ان پر مہمل گوئی کی تہمت لگادی۔ ان کی غلط روی کے اور تو اور، میر بھی قائل تھے۔ حالی نے خود مرزا کی زبانی یہ روایت درج کی ہے [4]۔

''خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی میر نے جو مرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''

میر کا انتقال 1225ھ (1810) میں ہوا۔ اور مرزا 1812-1813ء میں آگرے سے دہلی آئے۔ گویا بروایت حالی [5] مرزا کا کلام نواب حسام الدین حیدر خاں نے مرزا کے قیام آگرہ کے زمانے میں لکھنؤ لے جاکر میر کو دکھایا جس پر انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا۔ اگر میر کی یہ رائے تھی کہ انھیں سیدھے راستے پر ڈالنے کی ضرورت ہے تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ عوام کی کیا رائے ہوگی!

میرزا آگرے سے اپنی شاعری اور طرز سخن ساتھ لے کر آئے۔ یہاں دہلی میں بھی مخالفت کم ہونے کا کیا امکان تھا! مشاعرے کی بھری مجلس میں حکیم آغا جان عیش نے اپنی غزل میں یہ قطعہ داخل کیا اور ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا [6]۔

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے مگر ان کی زبان وہ آپ سمجھیں، یا خدا سمجھے

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہے تم کہو اور دوسرا سمجھے

خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس پر غالب کے مخالفین نے ان کا کیسا مذاق اڑایا ہوگا۔ اور کیسے انھیں خفیف کرنے کی کوشش کی ہوگی، مگر ان کی زبان یہ آپ سمجھیں، یا خدا سمجھے، میرزا کی پریشانی

بجا تھی۔

حالی کی روایت ہے[7]

''سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے، تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔''

حالی نے اسی طرح کا ایک واقعہ مولوی عبدالقادر رامپوری کا لکھا ہے[8]۔ موصوف نہایت ظریف الطبع تھے۔ چند روز کے لیے ان کا تعلق قلعہ دہلی سے بھی رہا۔ ایک دن انھوں نے غالب سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آیا، اس کے معنی بتا دیجیے اور جھٹ سے دو مصرع موزوں کر کے پڑھ دیے۔

پہلے تو روغنِ گل، بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے، کل بھینس کے انڈے سے نکال

میرزا نے احتجاج کیا اور کہا کہ حاشا، یہ شعر میرا نہیں، لیکن مولوی صاحب موصوف نے اصرار کیا اور فرمایا کہ نہیں، میں نے خود آپ کی غزل میں یہ شعر دیکھا ہے۔ مرزا سمجھ گئے کہ ان کا مقصود در پردہ یہ بتانا ہے کہ تم اس طرح کے بے معنی شعر کہتے ہو۔ مشاعروں میں مخالفین ان سے کیوں کر پیش آتے تھے، اور وہ کیسی تیاریاں کر کے آتے تھے، اور ان میں کس طرح کی گفتگو اور چہ می گوئیاں ہوتی تھیں، مرزا کا اپنا ایک شعر بھی اس صورتحال کا غماز ہے:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

اور جب معترضوں کی چہ میگوئیاں کسی طرح کم نہ ہوئیں تو انھوں نے جل کر سب کو جواب دے دیا۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن ابھی تک انھیں کسی وسیع پیمانے پر مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ جو کچھ ہوا مقامی

طور پر اور اس کے اثرات بھی ایک محدود حلقے سے متجاوز نہیں ہوئے۔

3۔ کلکتے کا ادبی معرکہ

ان کی زندگی کا سب سے پہلا اہم ادبی معرکہ کلکتے میں ہوا۔

میرزا 1825ء کے اواخر میں اپنی خاندانی پنشن کے سلسلے میں کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے سارے کوائف رکھ کر داد خواہی کریں۔ وہ رستے میں مختلف مقامات پر رکتے ہوئے فروری 1828ء میں کلکتے پہنچے تھے[9]۔

کلکتے کا مدرسہ عالیہ علم و ادب کا مشہور مرکز تھا۔ یہاں ان دنوں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو بزم سخن آراستہ ہوتی، جس میں شہر کے اہل علم جمع ہوتے، شاعر حضرات اپنا کلام سناتے اور اصحاب فہم سے داد وصول کرتے۔ میرزا بھی اسی طرح کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے اور انھوں نے اپنی غزل پیش کی۔

تا کیم دودِ شکایت زبیاں برخیزد　　　بزن آتش کہ شنیدن زمیاں برخیزد

اس غزل میں ایک شعر ہے۔

جزوے از عالم واز ہمہ عالم بیشم　　　ہچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرع اولیٰ میں ہمہ عالم کی ترکیب غلط ہے۔ ہمہ جمع اور عالم واحد۔ بحسب اجتہادِ قتیل یہ اجتماع جائز نہیں۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ بیشم کی جگہ تفصیل بعض 'بیشترم' چاہئے تھا۔ کسی اور نے کہا کہ ''موئے زمیاں'' کی ترکیب غلط ہے۔ غرض کہ پورا شعر ہی غلط ہے۔

جیسا کہ غالب نے عبدالرزاق شاکر کے نام خط میں لکھا ہے[10] اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے، جن میں ''ہمہ عالم'' و ''ہمہ روز'' و ''ہمہ جا'' مرقوم تھا اور وہ اشعار ''قاطع برہان'' میں مندرج ہیں۔

''قاطع برہان'' میں لکھتے ہیں۔[11]

''یکے از پرورش یافتگان قتیل نومسلم در کلکتہ بمن گفت: استاد دربارۂ ''کدہ'' و''ہمہ'' کہ آں مرادف خانہ وایں ترجمۂ تمام است، از روی اجتہادی کہ بدانست پیروانِ خویش دارد، جز اسمی چند کہ شمار آں از پنج یا شش نگزرد، ماقبل کدہ آوردن واسمِ مفرد مابعد لفظ ہمہ بتشستن جائز نمی شمارد، پاسخ گزاردم کہ بیخبراں بگفتۂ، چوں خودی کار بر خود تنگ گیرند، آگاہ واں راچہ افتادہ کہ توقیع ناروا راپز یرند! حیرت کدہ وظلمت کدہ (وصفوتکدہ) وشفق کدہ وخرکدہ ورامثالِ ایں ہا درنظم ونثر اہل عجم بسیار است۔ فخر المتاخرین فرماید، شعر:

خاموش، حزیں! کز نفس سینہ خراشت
نشتر کدہ گردید جگر، مرغِ حرم را

ہمچنیں ہمہ روز وہمہ شب وہمہ عالم وہمہ جا در کلام گرانمایگان ہزار جا دیدہ ایم، حافظ علیہ الرحمہ راست شعر:

گرمن آلودہ دامنم چہ عجب   ہمہ عالم گواہِ عصمت اوست

سعدی رحمۃ اللہ علیہ راست، شعر:

بجہاں خرم ازانم کہ جہان خرم از وست
عاشقم برہمہ عالم کہ ہمہ عالم از وست

محمد حسین نظیری نیشاپوری کہ مینو نشیمنش باد، می سراید، شعر:

چوسگان ازان بکویت ہمہ شب قلادہ خایم
کہ ہوائے صید دارم نہ خیالِ پاسبانی

دیگرے گوید، مصرع:

ہمہ جا خانۂ عشقست، چہ مسجد چہ کنشت۔ یارب! چگونہ روا باشد کہ ہندوئی بربستہای پارسیاں را بہم برزند، واز پیش خویش درفن گفتار آئینے تازہ انگیزد!

یہی وجہ تھی کہ جب مشاعرہ گاہ میں لوگوں نے بسند قتیل ان پر اعتراض کیا، تو انھوں نے ڈانٹ کر کہا کہ قتیل، کون قتیل! وہ فرید آباد کا کھتری بچہ! اساتذہ ایران کے مقابلے میں اس کی

حیثیت ہی کیا ہے کہ اس فرومایہ کی سند قبول کرلوں!

غالب کی ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے

می رود خندہ بسامانِ بہاراں زدہٗ   خونِ گل ریختہ و لے بگلستان زدہٗ

معلوم نہیں، یہ غزل انھوں نے اسی مشاعرے میں پڑھی تھی، یا کسی دوسرے مشاعرے میں۔ بہرحال اس کے مندرجہ ذیل شعر:

شور اشکے بفشارِ بُن مژگان دارم   طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفان زدہ

پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اس میں ردیف زدہ بہمزہ کا استعمال غلط ہے۔

اس زمانے میں کلکتے میں قتیل کے شاگردوں اور مداحوں اور پیرووں کی اچھی بڑی تعداد مقیم تھی اور شہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کا خاصا اثر تھا۔ غالب پر جو اعتراضات ہوئے ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس مشاعرے میں بھی یہ اصحاب کچھ کم نہیں تھے۔ غالب نے جب قتیل کی سند ماننے سے انکار کردیا اور ان کے خلاف تحقیر آمیز الفاظ استعمال کیے تو اس پر ہنگامہ بپا ہوگیا۔ غالب کی طرف سے جن دوستوں نے اعتراضات کے جواب دیے ان میں نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی (متولی امام باڑہ ہوگلی)، مولوی محمد محسن، مرزا حسین علی خاں (سفیر میرزا کامران درّانی والیِ ہرات) الملقب بہ کفایت خاں اور مولوی محمد عبدالکریم (میر منشی دفتر فارسی گورنر جنرل) کے نام ہمیں معلوم ہیں [12]۔ لیکن مخالفت کسی طرح فرو نہ ہوئی۔ معاملہ مشاعرہ گاہ سے نکل کر کوچہ و بازار تک پہنچ گیا۔ مخالفوں نے ان کے کلام پر اعتراض لکھ لیے اور غالباً انھیں شائع کردیا تھا [13]۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بے محل نہیں ہوگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی کتاب ''غالب'' پر جو تعلیقات قلمبند کی تھیں، ان میں لکھتے ہیں [14] کہ جن لوگوں نے غالب کے خلاف یہ ہنگامہ برپا کیا تھا، ان میں تین اصحاب کے نام معلوم ہوسکے۔ (1) احمد علی گوپاموی (2) مولوی احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ، اور (3) مولوی وجاہت علی لکھنوی۔

(1) اور (3) کے بارے میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں، لیکن مولوی احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ کا نام اس سلسلے میں لینا یقیناً درست نہیں۔ ان کی تاریخ ولادت 17/دسمبر 1839ء ہے [15]، جب کہ غالب کو یہ ہنگامہ 1828ء میں پیش آیا تھا۔

بہرحال جب مخالفت کسی طرح کم نہ ہوئی اور لوگ ان پر بازاروں میں آوازے کسنے لگے تو نواب اکبر علی خاں طباطبائی اور مولوی محمد محسن کے مشورے[16] پر انھوں نے اپنی مشہور مثنوی لکھی جواب ''بادِ مخالف'' کے عنوان سے ان کے کلیات نظم فارسی میں شامل ہے، پہلے اس کا نام ''آشتی نامہ'' تھا۔

اس مثنوی میں پہلے انھوں نے کچھ تملق اور چاپلوسی سے کام لیا ہے۔ کلکتہ کے صاحبان علم و فضل کی تعریف کی ہے اور پھر اپنی خستگی اور بیکسی کا بیان کر کے ان سے ہمدردی اور مہمان نوازی کی درخواست کی ہے۔ پھر کہتے ہیں[17]:

برغریباں کجا رواست ستم	رحم اگرنیست خود چراست ستم
وربگوئید ماجرائی رفت	از تو در گفتگو خطائی رفت
مہربانان خدائے را، انصاف	تانخست ازکہ بودرسمِ خلاف
نمک اندرسُبوے مے کہ فگند	بچمن رستخیز دَے کہ فگند
زلفِ گفتار را کہ درہم کرد	بزمِ اشعار را کہ برہم کرد
ہمہ عَالم غلط کہ گفت نخست!	پارۂ زیں غلط کہ گفت نخست!
''بیش'' ''رابیشتر'' کہ گفت کہ گفت	بدزمن پیشتر کہ گفت کہ گفت!
''موے را برکمر'' کہ گفت غلط	شعر را سربسر کہ گفت غلط
چوں بدیدند کاعتراض خطاست	ہر چہ غالب نوشتہ است، بجاست
رشتۂ باز پُرس تاب کہ داد	معترض راز من جواب کہ داد
چوں بدیدید بیگناہی من	تان نہ شُستید رُو سیاہی من
ہرکہ دیدم، رہِ خموشی رفت	بود لازم براں گرفت، گرفت!
از چہ بودآں بعرصہ دم نزدن	دررہِ آگہی قدم نزدن!
نکشودن لبے بیاوریم	خیرہ بگزاشتن بداوریم!
ازغمِ دل ستوہ گردیدم	چہرہ بایک گروہ گردیدم!
گلہ مندانہ گفتگو دارم	پارہ در سخن غلودارم!

چوں شنیدم کہ نکتہ پردازاں قدر دانان وانجمن سازاں
از من آزردہ اند زاں پاسخ بہ نیایش بخاک سُودم رُخ
خجلت آوردم وجنوں کردم خویشتن آب ودیدہ خوں کردم

چند شعروں کے بعد دوسری غزل کی ردیف ''زدہ'' پر اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

باوجودے کہ شعر من صافست زدہ رامی زند، چہ انصافست
اعتراض آتشم بجاں زدہ است شعلہ در مغز استخواں زدہ است
زدہ راکسرہ از ظرافت نیست یای وحدت بود، اضافت نیست
واضع طرزِ ایں زمیں نہ منم درخورِ سرزنش ہمیں نہ منم
دیگراں نیز گفتہ اند چنیں گوہرِ راز سفتہ اند چنیں
شورش آمادہ رفتہ اند ہمہ ہم بریں جادہ رفتہ اند ہمہ
در نوردِ گزارشِ زدہ ہا کردہ اند از نشاط عربدہ ہا
اکثر از عالمِ شتاب زدہ مے زدہ، غم زدہ، شراب زدہ
مے زدہ، غمزدہ کہ ترکیب ست! بخیال فقیر تقلیب ست
چوں برآید ز انگبیں موش زدۂ غم دمد زِ مفہومش
دیں خود از شان فاعلست کہ ہست حق بود حق نہ باطلست کہ ہست
ہمچناں آں محیطِ بے ساحل قلزم فیض میرزا بیدل
از محبت حکایتے دارد کہ بدینساں بدایتے دارد
''عاشق بیدلے جنوں زدۂ قدم عاشقی بخوں زدۂ''
گرچہ بیدل زاہلِ ایراں نیست لیک ہمچوں قتیل ناداں نیست
صاحب جاہ و دستگا ہے بود مردرا زیں نمد کلا ہے بود
نہ غلط گفتہ است در خود گفت راست گویم در آشکار ونہفت
دعویٰ بندہ بیسرو بُن نیست شعرِ بیدل بجز تفنن نیست

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں چند دن کے لیے ایک کام سے یہاں آیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے جانے کے بعد اہل کلکتہ مجھے اس طرح یاد رکھیں کہ دلی سے ایک بیوقوف آیا تھا، جس نے بزرگوں سے بیکار کا جھگڑا کھڑا کیا۔ وائے بر من کہ میں اپنے وطن کی بدنامی کا باعث بنوں اور جب کوئی مجھے یاد کرے، تو کہے: خس کم جہاں پاک۔

تابِ ہنگامہ ام خدارا نیست ۔۔۔ مہربانان! دل است، خارا نیست
ویں کہ در پیش گاہِ بزمِ سخن ۔۔۔ بہ زبانہا فتادہ است زمن
کہ فلاں باقتیل نیکو نیست ۔۔۔ مگسِ خوانِ نعمتِ اُونیست
خود کسے ناسزا چرا گوید ۔۔۔ ناسزا آں کہ ناسزا گوید
فیضے ازصحبت قتیلم نیست ۔۔۔ رشک بر شہرت قتیلم نیست
نہ ہوا خواہیے، نہ دشمنیے ۔۔۔ درمیان است پاے ہمفنیے
حاش للہ کہ بدنمی گویم ۔۔۔ واں ہم از پیشِ خودنمی گویم
مگر آناں کہ پارسی دانند ۔۔۔ ہم بریں قول وعہد وپیمانند
کہ زاہلِ زباں نبود قتیل ۔۔۔ ہرگز از اصفہاں نبود قتیل
لاجرم اعتماد را نسزد ۔۔۔ قول وے استناد رانسزد
کایں زباں خاص اہل ایران است ۔۔۔ مشکلِ ما و سہل ایران است
سخن است آشکار پنہاں نیست ۔۔۔ دہلی و لکھنوَ ز ایراں نیست

اس کے باوجود اگر احباب کو یہ شکایت ہے کہ میں کیوں قتیل کی پیروی نہیں کرتا اور اپنا دلیل راہ تسلیم نہیں کرتا تو حبۃً للہ فرمایئے:

کہ چساں از حزیں بہ پیچم سر ۔۔۔ آں بہ جادو وی بدہر سمر
دل دہد کزا اسیر برگردم ۔۔۔ زاں نو آییں صفیر برگردم
دامن از کف کنم چگونہ رہا ۔۔۔ صائب و عرفی و نظیری را
پردہ سنجانِ باستانی را ۔۔۔ طالب وسعدی وفغانی را
خاصہ روح وروانِ معنی را ۔۔۔ آں ظہوری جہان معنی را

ظاہر ہے کہ ان مسلم الثبوت اساتذہ، اہل زبان کے مقابلے میں قتیل اور اس کے خواجہ تاشوں کی کیا حیثیت ہے! لیکن اس کے باوجود یہ اضافہ کر کے مثنوی ختم کر دیتے ہیں۔

فتنۂ گفتگوے اینانم	مستِ لاے سبوے اینانم
لیک باآں ہمہ کہ ایں دارم	گنجِ معنی درآستیں دارم
می شوم خویش را بہ صلح دلیل	می سرایم نواے مدحِ قتیل
تانماند دگر زمن گلۂ	رسد ازپیروان وے صلۂ
گفتنِ آیینِ ہوشیاری نیست	لیک دانستن اختیاری نیست
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت	سعدیِ ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است	از من و ہمچومن ہزار بہ است
من کفِ خاک اُو سپہر بلند	خاک را کے رسد بہ چرخ کمند
وصفِ اوحدّ چوں منے نبود	مہر در خوردِ روز نے نبود
مرحبا ساز خوش بیانی اُو	حبّذا شور نکتہ دانی اُو
نثر او بال نقش طاؤس است	انتخاب صراح وقاموس است
بہ وجودِ چنیں شگرف بیان	شکوہ دارد عجم زہند ستان
ایں رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال	بوے سطرے زنامۂ اعمال
از من نارساے ہیچ مداں	معذرت نامہ ایست زی یاراں
بوکہ آید زعذر خواہی ما	رحم بر ما وبیگناہی ما
آشتی نامۂ ودادِ پیام	ختم شد، والسلام والاکرام

بظاہر اس آشتی نامے سے اہل کلکتہ کی اشک شوئی ہوگئی اور اس کے بعد ان کی غالب کی مخالفت میں وہ شدت نہیں رہی۔ بہر حال، جیسا کہ آپ نے دیکھا، اس معرکے میں میدان غالب کے ہاتھ رہا۔ انھوں نے جو موقف پہلے دن اختیار کیا تھا، اس سے ذرہ برابر نہیں ہٹے۔ بحث اس پر چھڑی تھی کہ غالب کے کلام میں غلط ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں جسے معترضین نے ان کے نقصِ علم اور فارسی سے ناواقفیت پر محمول کرنا چاہا تھا۔ لیکن اہل زبان کے مستند اساتذہ کے کلام سے شہادتیں

مل گئیں کہ یہ اعتراض غلط تھے۔

لیکن اس ہنگامے سے ایک دوررس نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہندوستانی فارسی شعرااور ادبا کے نکتہ چیں بن گئے۔ان کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی قابل استناد نہیں۔ایک حضرت امیر خسرو کو چھوڑ کر وہ زندگی بھر سب کے منکر رہے اور تو اور وہ فیضی کو بھی پورے طور پر قابل اعتماد تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اب تک ہمیں غالب کے جو اردو خطوط ملے ہیں، ان میں سب سے پرانا خط 1846ء کا ہے۔(اگر چہ یہ آج تک شائع نہیں ہوا) گویا کلکتے کے اس ہنگامے اور اس خط میں کوئی 18 برس کا وقفہ ہے۔مطبوعہ خطوں میں بلا مبالغہ بیسیوں جگہ غالب نے قتیل کے (اور اسی ضمن میں دوسرے ہندوستانی فارسی گویوں کے) خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔وہ انھیں ''راہِ سخن کے غول'' اور ''آدمی کے گمراہ کرنے والے'' کہتے ہیں۔لیکن وہ سب سے زیادہ مخالف قتیل کے ہیں۔جہاں بھی موقع ملتا ہے، وہ اسے نہیں بخشتے بلکہ ان کے خیال میں ہندوستان میں فارسی کو سب سے زیادہ نقصان قتیل نے ہی پہنچایا۔اس مخالفت کی بنیاد یہیں کلکتے میں پڑی۔چونکہ ان پر اعتراض قتیل کی سند سے کیا گیا تھا، اس لیے وہ خاص طور پر اس کے خلاف ہو گئے۔انہیں تعجب اس پر تھا کہ جب نظیری وغیرہ اساتذہ عجم کے کلام سے اسناد پیش کی جا رہی ہوں، تو ان کے مقابلے میں قتیل کی رائے کو وقعت ہی کیوں دی جائے۔ان کا ایک شعر بھی ہے۔

غالب سوختہ جاں راچہ بگفتار آری
بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

4۔قاطع برہان کا معرکہ

غالب کی زندگی کا سب سے اہم اور طویل معرکہ 1862ء میں اس وقت شروع ہوا جب انہوں نے اپنی کتاب قاطع برہان شائع کی۔اس کتاب کی داغ بیل پانچ سال پہلے 1857ء میں پڑی تھی۔

10 رمئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی میں ہندستانی فوج نے اپنے غیر ملکی انگریز افسروں کے

خلاف بغاوت کر دی۔ پہلے افسروں کو موت کے گھاٹ اتارا، پھر جیل کے دروازے کھول کر بندیوں کو آزاد کر دیا۔ یہ گویا ملک گیر بغات کا اعلان تھا۔ اسی کو انگریزی مورخوں نے غدر کا نام دیا ہے۔

اس باغی سپاہ کے سرغنے خوب جانتے تھے کہ جب تک دلی کے صاحب اثر لوگ ان کے ساتھ شامل نہں ہوتے، ان کا یہ انتہائی اقدام مقامی حادثہ بن کر رہ جائے گا، اور وہ بآسانی کچل کے رکھ دیے جائیں گے۔ لہٰذا ان میں سے کچھ لوگ راتوں رات 60-65 کلومیٹر کی مسافت طے کر کے اگلی صبح 11 رمئی 1857ء کو لال قلعہ دلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو مجبور کیا کہ وہ ان کی کمان اپنے ہاتھ میں لیں اور انگریزوں سے مقابلے میں ان کی قیادت کریں۔ بہادر شاہ، جیسا کہ ظہیر دہلوی نے لکھا ہے [18] اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اور اسے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے تباہ کن اقدام خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے باغیوں کی حمایت کی ہامی بھر لی۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے اور ہمارے موضوع سے خارج۔

11 رمئی 1857ء سے دلی پر دیسی سپاہ کا قبضہ ہو گیا۔ شہر میں جو انگریز مقیم تھے ان میں سے جو باغیوں کے ہتھے چڑھا، تہ تیغ کر دیا گیا۔ بقیہ شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، جسے جہاں جگہ ملی اس نے وہاں پناہ لی۔ جن مقامی باشندوں سے متعلق شبہ ہوا کہ یہ انگریزوں کا دوست اور بہی خواہ ہے، وہ خاص طور پر باغیوں کا مورد عتاب ہوا۔ نہ اس کے جان و مال محفوظ تھے، نہ حُرمت و ناموس۔ غالب چونکہ نصف صدی سے انگریزوں کے وظیفہ خوار رہے تھے، اس لیے انہیں بجا طور پر اندیشہ تھا کہ کہیں ان کا بھی گھر بار نہ لُٹ جائے یا بیوی بچے نشانہ ستم بنیں۔ لہٰذا انہوں نے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کی کہاوت پر عمل کیا۔ گھر کی چہار دیواری میں محصور ہو کر بیٹھ رہے۔ اشد ضرورت کے سوائے گھر سے باہر جانا آنا بند کر دیا کہ نہ کوئی انھیں دیکھے، نہ یہ کسی کی آنکھ میں کھٹکیں۔

لیکن گوشہ نشیں ہو جانا جتنا آسان ہے، بیکار وقت کاٹنا اتنا ہی مشکل ہے۔ بارے، ان کی مطالعے کی عادت ان کے آڑے آئی۔ جس شخص سے وہ پڑھنے کو کتابیں کرایے پر لیا کرتے تھے، وہ تو ان تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ گھر پر لے دے کے صرف دو کتابیں تھیں۔ دساتیر اور فارسی لغت کی

مشہور کتاب برہان قاطع مولفہ محمد حسین تبریزی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ بغور دیکھنے پر وہ اس میں قدم قدم پر مختلف قسم کے اغلاط سے دوچار ہوئے۔ وہ کتاب کے حاشیے میں اشارات قلمبند کرتے رہتے، کہیں سنجیدگی سے معنی کی تصحیح کردیتے، کہیں اس کی لغویت پر کوئی لطیفہ یا چٹکلا لکھ دیتے۔ جب وسط ستمبر 1857ء میں شہر میں امن کی صورت قائم ہوئی، دوبارہ رابطہ قائم ہوا، تو کسی نے ان سے فرمائش کی کہ ان حواشی کو یکجا لکھوالیا جائے تو یہ فارسی کے طلبا کے لیے مفید ہوں گے۔ چنانچہ تمام حواشی بین الدفتین لکھوالیے گئے اور ان کے مختلف دوستوں نے اس مسودے کو بغرضِ استفادہ دیکھا۔ شروع میں انہیں اسے شائع کرنے کا ارادہ نہیں تھا، لیکن بعد کو انہیں خیال ہوا ہوگا کہ اگر یہ شائع کردیا جائے، پھر میرا پرانا دعویٰ کہ ہندوستان کے فارسی گو، غلط فہم اور غلط نویس ہیں، پورا ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ کتاب قاطع برہان کے عنوان سے 1862ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں صرف 97 صفحات ہیں، آخر میں ایک صفحہ کا غلط نامہ ص 98 پر ہے۔ اس کی قیمت ایک روپے مقرر ہوئی تھی۔ بعد کو انہوں نے اس میں اضافہ کرکے اسے دوسری مرتبہ درفش کاویانی کے نام 1865ء میں چھپوایا۔ یہ ایڈیشن اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا، اس میں متن کا غلط نامہ وغیرہ ملا کر کل 154 صفحات ہیں۔

کتاب کا شائع ہونا تھا کہ معتقدان برہان قاطع، برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہیں یہ کون ہوتا ہے، ایک مشہور و معروف مؤلف لغت پر اعتراض کرنے والا! مولانا حالی لکھتے ہیں[19]:

> ''مخالفت کی وجہ ظاہر ہے۔ تقلید نہ صرف امور مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام اور ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری شے ہوگئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی دل میں خطور کرتا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے۔ جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جاچکی ہے، وہ وحیِ منزّل کی طرح واجب التسلیم سمجھی جاتی ہے۔ پس مرزا کے اعتراضات برہان قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجب ہوتے، ممکن نہ تھا کہ ان کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی۔

بہر حال بڑا گھمسان کا رَن پڑا۔ سب سے پہلے جو کتاب قاطع برہان کے جواب میں شائع ہوئی، وہ سید سعادت علی کی محرق قاطع برہان ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ اس میں 96 صفحات ہیں اور یہ 1280ھ (1865ء) میں مولوی امو جان کے مطبع احمدی، دلہائی شاہدرہ میں چھپی تھی۔

''محرق قاطع برہان'' کے جواب میں غالب کی حمایت میں تین چیزیں شائع ہوئیں۔

1۔ ''دافع ہذیان'' از سید محمد نجف علی خاں، 28 صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ یہ 1281ھ (1865ء) میں اکمل المطابع دہلی میں چھپا۔

2۔ ''لطائف غیبی'' از میاں داد خاں سیاح۔ 41 صفحات کا یہ مختصر رسالہ اردو میں ہے، یہ بھی 1281ھ (1865ء) میں اکمل المطابع، دہلی میں چھپا تھا۔ اس میں 20 لطیفے ہیں۔ ہر ایک لطیفہ ''محرق قاطع برہان'' کی کسی عبارت پر مبنی ہے، جس میں سید سعادت علی کی عبارت کی بے ربطی، غلطی یا کج فہمی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

3۔ سوالات عبدالکریم، آٹھ صفحے کا یہ اردو رسالہ بھی اکمل المطابع دہلی میں 1281ھ (1865ء) میں چھپا تھا۔ اس میں سید سعادت علی مصنف ''محرق قاطع برہان'' سے 16 سوالات پوچھے گئے ہیں۔ ان کے بعد آخر میں دو سوالوں پر مشتمل ایک فتویٰ ہے۔ (1) قواعد مقررہ فارسی کے مطابق صیغہ امر کے بعد مجرد الف افادۂ معنی فاعلیت کرتا ہے، اور اسم جامد کے آگے الف نون مفید معنیِ جمع ہے۔ الف نون سے معنی فاعل کے لینے کا قصد کرنا ناشی غفلت سے ہے، یا نہیں۔ (2) رواں، دواں افتاں و خیزاں، صیغہ ہائے امر کے آگے الف نون جو آتا ہے وہ حالیہ کہلاتا ہے۔ الف نون حالیہ کے وجود کا منکر مسلمات جمہور کا منکر ہے یا نہیں؟ فتوے کے ساتھ محمد سعادت علی خدا بخش، محمد نصیر الدین، محمد لطیف، حسین محمد فضل اللہ اور نجف علی کے تائیدی جواب ہیں۔ دوسرے سوال کے جواب میں غالب کی تائید بھی شامل فتویٰ ہے۔[20]

''قاطع برہان'' کے جواب میں دوسری کتاب ''ساطع برہان'' تھی۔ اس کے مؤلف مرزا رحیم بیگ میرٹھی تھے، جو اپنے آپ کو امام بخش صہبائی کا شاگرد کہتے تھے۔ رحیم پڑھے لکھے آدمی تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرٹھ میں مکتب پڑھاتے تھے۔ اخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ انھوں نے ساطع برہان اسی زمانے میں لکھی تھی۔ وہ املا کراتے تھے اور کوئی

اور شخص اسے لکھتا رہا۔ اس سے ان کے حافظے کی قوت اور وسعت مطالعہ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب مطبع ہاشمی، میرٹھ میں 1281ھ (1865ء) میں چھپی۔ 174 صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کے جواب میں خود غالب نے ایک خط (اردو میں) مرزا رحیم بیگ کے نام لکھا اور اسے الگ سے چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ نامۂ غالب کے عنوان سے 16 صفحوں پر 1865ء میں مطبع محمد (محمد میرزا خاں) دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے بعد یہ عود ہندی میں شامل ہوا اور اب تمام مجموعوں میں ملتا ہے۔

مخالفین کی ابھی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ 1283ھ (1867ء) میں امین الدین امین دہلوی نے ''قاطع القاطع'' شائع کی۔ یہ مطبع مصطفائی دہلی میں چھپی۔ پوری کتاب میں 268 صفحات ہیں۔ دراصل ''قاطع برہان'' کے جواب میں سب سے پہلے یہی کتاب لکھی گئی، اگرچہ یہ شائع بعد کو ہوئی۔ اس کا مادۂ تاریخ ''فراغ'' ہے جس سے (1281) برآمد ہوتے ہیں اور تو اور سید سعادت علی نے اپنی کتاب ''محرق قاطع برہان'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (ص 64) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کا مسودہ دیکھا تھا۔ کسی وجہ سے یہ کتاب جلد شائع نہ ہو سکی اور سید سعادت علی نے اپنی کتاب پہلے شائع کر دی۔

اس کتاب (قاطع القاطع) کی زبان اتنی پوچ اور فحش ہے کہ غالب نے اسے نظر انداز کر دیا۔ غالب کے جواب میں سب سے وقیع کتاب آغا علی احمد جہانگیر نگری نے بعنوان ''موید برہان'' شائع کی۔ یہ کتاب 468 صفحات پر مشتمل ہے اور ٹائپ کے حروف میں مطبع مظہر العجائب کلکتہ میں 1282ھ (1866ء) میں چھپی۔ ابھی کتاب دلی نہیں پہنچی تھی کہ دوستوں نے کلکتے سے غالب کو اس کے بارے میں اطلاع دی، اس پر انھوں نے 31 شعر پر مشتمل ایک قطعہ فارسی زبان میں لکھا۔ یہ بعد کو ''سبد چین'' میں شامل کیا گیا۔ ''موید برہان'' کا جواب غالب نے خود دیا۔ انھوں نے 32 صفحات کا مختصر رسالہ ''تیغ تیز'' کے نام سے لکھا تھا۔ یہ 1867ء میں اکمل المطابع دہلی میں چھپا۔ اس میں 17 فصلیں ہیں۔ پہلی 16 میں ''موید برہان'' کے اعتراضوں کے جواب اور ان پر اپنے اعتراض ہیں۔ آخری سترہویں فصل میں ''برہان قاطع'' پر مزید اعتراض ہیں۔

''تیغ تیز'' کے آخر میں 16/ادبی سوالات کا ایک استفتا ہے۔ان کے جواب نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے دیے ہیں اوران کی تائید مولانا حالی، محمد سعادت علی اورنواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے کی ہے۔

مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری نے جواب میں ''شمشیر تیز تر'' شائع کی۔اس دوران میں میرزا غالب نے ''قاطع برہان'' کا دوسرا ایڈیشن ''درفش کاویانی'' شائع کردیا تھا۔اس میں مزید فوائد اوراعتراضات شامل کیے گئے تھے۔احمد نے ان اعتراضات کے اور ''تیغ تیز'' کے مشمولہ نکات کے جواب دیے۔کتاب کا نام تاریخی ہے۔جس سے 1867ء برآمد ہوتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود کہ کتاب پر تاریخ طباعت 1868ء چھپی ہے، یہ شائع 1286ھ ہوئی، جیسا کہ اس کی تاریخ طباعت ''ترکی دادہ جواب ترکی'' سے ظاہر ہے۔غالب اس کی اشاعت سے پہلے ذی القعدہ 1285ھ میں اپنے خالق حقیقی کے حضور حاضر ہو چکے تھے۔

اس معرکے کے دوشاخسانے نکلے۔غالب نے جب احمد جہانگیر نگری کو مخاطب کر کے اپنا مشارٌ الیہ قطعہ لکھا، جس کا مطلع تھا:

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ　　　درخصوصِ گفتگوے پارس انشا کردہ است

تواس کے جواب میں احمد نے ایک قطعہ لکھا اوراپنے ایک شاگرد عبدالصمد فدا اسلہٹی کے نام سے شائع کردیا۔اس کا عنوان ''ہنگامۂ دل آشوب'' (1) میں ہے۔''دو میں قطعہ کہ مولوی احمد علی صاحب بجواب قطعہ حضرت غالب نگاشتہ از نام عبدالصمد فدا اسلہٹی شاگرد خود شہرت داد۔'' فدا کے جواب میں غالب کے دوشاگردوں محمد باقر علی باقر آروی اورسید فخر الدین حسین سخن نے ایک ایک قطعہ لکھا۔ان چاروں قطعوں کا مجموعہ ''ہنگامۂ دل آشوب'' کے نام سے منشی سنت پرشاد کے مطبع آرہ (ضلع شاہ آباد بہار) میں ذی القعدہ 1283ھ (اپریل 1867ء) میں چھپا۔

اس کے بعد عبدالصمد فدا نے (یا خود احمد جہانگیر نگری نے) باقر اور سخن کے قطعوں کا جواب لکھا اوراسے پہلے چاروں قطعوں کے ساتھ شامل کرکے ''تیغ تیز تر'' کے نام سے 1284ھ (1867ء) میں غلام نبی خان کے مطبع نبوی میں چھاپ کرشائع کیا۔اب جواہر سنگھ جوہر لکھنوی [21] (شاگرد ناطق مکرانی) میدان میں اترے۔انھوں نے ایک قطعہ لکھا جو دراصل احمد جہانگیر نگری کی

حمایت اور غالب کی مخالفت میں تھا لیکن اس کا اظہار انھوں نے صاف لفظوں میں برملا نہیں کیا، البتہ بین السطور سے ان کا مقصد عیاں ہے۔ فدا کے قطعے (مشمولہ تیغ تیزتر) اور جوہر کے اس قطعے کے جواب میں پھر باقر اور سخن نے ایک ایک قطعہ لکھا۔ اسی دوران میں میر آغا علی شمس لکھنوی نے ایک نثری مضمون میں غالب کے بعض اشعار پر اعتراض کیے جو اودھ اخبار (25/ جون 1867ء) میں چھپا۔ سخن نے اس کا جواب اردو نثر میں لکھا اور باقر نے فارسی نثر میں۔ ایک اور صاحب محمد امیر امیر لکھنوی نے غالب کی حمایت میں ایک اردو قطعہ اودھ اخبار میں چھپوایا۔ ان پانچوں قطعوں اور دونوں نثری مضامین کا مجموعہ بھی ہنگامۂ دل آشوب حصہ دوم کے عنوان سے جمادی الاول 1284ھ (دسمبر 1867ء) میں منشی سنت پرشاد کے مطبع سے شائع ہوا۔

یہ تمام منظومات (محمد امیر امیر لکھنوی کے قطعے کے علاوہ) فارسی میں ہیں اور ان سب کی زمین وہی ہے جو غالب کے پہلے قطعے کی تھی، انشا کردہ است، تقاضا کردہ است۔

دوسرا شاخسانہ وہ مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی تھا جو غالب نے قاطع القاطع کے مصنف امین الدین امین دہلوی کے خلاف دائر کیا۔ وہ پٹیالے میں ریاست کے مدرسے میں مدرس تھے۔ سب سے پہلے انھیں نے غالب کا جواب لکھنے کا خیال کیا تھا۔ ان کی کتاب 1281ھ میں مکمل ہوگئی تھی، لیکن یہ شائع 1283ھ میں ہوئی۔

بد قسمتی سے انھوں نے اپنی کتاب میں جو زبان استعمال کی، وہ کسی سنجیدہ گفتگو یا علمی موضوع کے شایان شان نہیں تھی۔ اسی لیے غالب نے اسے درخورِ اعتنا نہ خیال کیا۔ کسی نے ان سے پوچھا: حضرت آپ نے سب کتابوں کا جواب دیا، لیکن مولوی امین الدین کا جواب نہیں لکھا، تو فرمایا: ''اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے۔''

لیکن بعد کو دوستوں کے کہنے سے یا خود بخود ان کے دل میں خیال آیا کہ مولوی امین الدین کی لغویت کو بالکل نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے 2/ دسمبر 1867ء کو ڈپٹی کمشنر دلی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمے میں منشی عزیز الدین بدایونی ان کے وکیل تھے۔ بنائے مقدمہ ''قاطع القاطع'' کی مندرجہ ذیل عبارتیں عرضی دعویٰ میں پیش کی گئی تھیں۔

ص13 (کتاب): با این بیچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است

ایضاً: پیش حاکم وقت رفتن زخم نہانی خویش وانماید

ص23: این خرعیسیٰ نمدِ زین را بر پشتِ خود نہادہ

ایضاً: بہ دُشنام پردازم

ص28: میانِ خونِ حیض غوطہ خورد

ص17، 42: کلالِ اکبرآبادی دریں جا تمسخر بہ کار بردہ

ص18، 19، 42: سیلی و گردنی ہارا برائے او بنیاد نہد

ص51: فصد باید کشاد تا جنونش باز رود

ص18، 61: این خبطی

ص20، 66: از خرابہٗ اکبرآباد بُوے بہ دہلی رسید

ص70: معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است

20/فروری 1868ء کی درخواست میں وکیل نے ان پر مندرجہ ذیل عبارتوں کا اضافہ کیا۔

ص127: اگر ایں چنیں تہمت (؟) را حاکم منصف می دید، بینی چہ گویم، گوشش می برید۔

ص141: بضاعتِ خواجہ ہمیں از راست ہر کس را نشان می دہد

ص142: معترض خایہ را چرا گرفت۔ مگر برائے ترکیب نان خورش گرفتہ باشد

ص164: جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزینہ را بہ اظہار آوردہ است

ص172: گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید، و زبان بہ قضا خواہد کشید

ص38: گوش او از بنا گوش بر کنند یا بہ سوراخش میخے زنند۔

عدالت نے فریقین کو اپنے اپنے گواہوں کی فہرست پیش کرنے کی ہدایت کی۔ اس پر مدعا علیہ مولوی امین الدین کے وکیل انبہ سہائے نے مندرجہ ذیل اصحاب کی فہرست داخل کی:

1۔ مولوی ضیاء الدین صاحب، پروفیسر عربی مدرسہ سرکاری

2۔ مولوی سدید الدین خان صاحب استاد میور صاحب سکریٹری اعظم

3۔ حکیم حشمت اللہ خاں صاحب

4۔ محمد حمید الدین خاں صاحب عرف عبدالحکیم صاحب

5۔ مولوی ابراہیم صاحب

6۔ مولوی محمد حسین صاحب

7۔ مولوی قمر الدین صاحب

غالب کی طرف سے پیش کردہ فہرست میں ان اصحاب کے نام تھے۔

1۔ مولوی منشی سعادت علی خاں صاحب مدرس کالج، دہلی

2۔ ماسٹر پیارے لال صاحب سکریٹری

3۔ مولوی نصیر الدین صاحب مدرس مدرسہ دہلی

4۔ مولوی لطیف حسین صاحب مدرس

5۔ منشی حکم چند صاحب مدرس کالج دہلی

دونوں فہرستوں پر سرسری نظر بتادے گی کہ مدعا علیہ کی فہرست کے پہلے دونوں نام ہی غالب کی پوری فہرست پر بھاری ہیں۔ اس کا جو اثر عدالت پر ہوا ہوگا، وہ ظاہر ہے کیونکہ یہ اصحاب علمی حلقوں میں بہت معروف تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ مقدمے کے دوران میں جب مولوی ضیاء الدین صاحب شہادت کے لیے حاضر ہوئے تو کسی نے حاکم عدالت کے کان میں کہا کہ مولوی صاحب بڑے معزز آدمی ہیں۔ انھیں بیٹھنے کو کرسی ملنا چاہیے۔ عدالت نے یہ مشورہ منظور کرلیا۔ اس کا حاضرین اور فریقین مقدمہ پر کیا اثر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس وقت کے انگریزی اخبار مفصلائٹ میں کسی نے احتجاجاً یہ خط چھپوایا۔

> ''میں سخت حیران و پریشان ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاء الدین کو کس بنا پر کرسی دی۔ اس رعایت سے غالب کے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں۔ لفٹنٹ گورنر کے دربار میں انھیں مولوی ضیاء الدین سے اونچے درجے پر بٹھایا گیا تھا۔''

فریقین کے گواہوں کے بیانات کو تفصیل سے درج کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ بطور نمونہ صرف مولوی ضیاء الدین کا بیان جو انھوں نے مدعا علیہ کی صفائی میں دیا، درج کرتا ہوں۔ اس سے

معلوم ہو جائے گا کہ دوسرے اصحاب نے کیا کیا گل افشانیاں کی ہوں گی، میں نے سابق اس کتاب کو دیکھا ہے۔

ص 13 میں جو عبارت لکھی ہے وہ ''حرکت ناکردنی''، یہ الفاظ کسو خاص حرکت پر خصوصیت نہیں دیکھی۔ اس کے معنی ہیں کہ ''وہ جو حرکت لائق کرنے کو نہ ہو۔'' ''لفظ ضربت ہا'' جو لکھا ہے اس کے معنی صرف مارنے کے ہیں۔ خصوصیت کسی دوسرے معنی پر نہیں رکھتا۔

''زخم نہانی'' کے معنی ہیں، ''زخم اندرونی'' یا صدمہ دل، استعمال معنی اس کے لوطیان میں چاہے جو کچھ لے لے، طرز عبارت سے جو کوئی دیکھے گا وہ معنی اس لفظ کے اور معنی کر کر خیال نہیں کر سکتا ہے۔ یہ عبارت بھی نہ فحش ہے نہ ناسزا گوئی ہے۔

(سوال وکیل مدعی کا) (جواب) ''زخم'' موصوف اور ''نہاں'' اس کی صفت ہے۔ ''نہاں'' کے معنی کسی نے مقعد کے نہیں لیے۔

ص 23 میں لکھا ہے: خرعیسیٰ خر کے معنی بیوقوف ہیں اور لفظ عیسیٰ سے عظمت اور بزرگی ہوتی ہے۔ جیسے کہ فریزر صاحب کمشنر دہلی یہاں مارے گئے ہیں۔ ان کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ یہ ہے۔

چوں فریزر کمشنر دہلی گشت مقتول از تفنگ بلا
زِ فلکِ چار میں ندا آمد خرِ عیسیٰ نمود واویلا [22]

''خرعیسیٰ'' ایسا ہے جیسا کہ کلب حسین اور کلب علی، چنانچہ والی رامپور کا نام کلب علی خاں ہے، معنی کتے علی کے۔

سوال وکیل مدعی: اس عبارت سے کیا مراد ہے؟

جواب۔ میرے نزدیک کوئی امر تضحیک کا نہیں ہے۔

ص 28 میں جو لکھا ہے کہ ''میاں خون حیض غوطہ خورد'' یہ صنعت ایہام ہے۔ بلحاظ حقیقی معنے کے کسی طرح مذمت نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کام بیوقوفی سے کرنا اور وہ کام جو نہیں کرنا ہے، یعنی خونِ حیض کا پینا نہایت بیوقوفی ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ خون حیض کہ بلحاظ رنگ ناپاک، مشابہت شراب سے ہے، گویا کثرت شراب۔

سوال وکیل مدعی: اگر آپ کتاب کو دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

جواب: لطیف عبارت ہے، اس واسطے ہم ہنسیں گے مگر تضحیک کسی طرح کی اس میں نہیں ہے۔ عرفی کا قول ہے

خونِ حیض دخترِ رز چو شد از لبہائے من

خون حیض عورتوں کو آیا کرتا ہے۔ اگر مرد کی نسبت کہا جائے تو معنی بیوقوفی کے ہیں، جیسا کہ حیض الرجال، مرد محل نہیں ہے حیض کے واسطے۔ اس کے معنی عیب اور بدگوئی کے ہیں۔

ص 38 میں لکھا ہے کہ:

گوش او از بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند

سوراخش کے شین کی ضمیر بہ موجب قاعدے کے قریب کی طرف ہوتی ہے۔ یعنی بر طرف کان، مطلب یہ ہے کہ کان کھولے جاویں، مگر صرف لواطت والے اور معنی بھی سمجھ سکتے ہیں۔

ص 42 میں لکھا ہے۔ کلال اکبرآبادی بہ معنی مے فروش، مگر اس شخص کے واسطے جو دائم الخمر ہو، عیب نہیں ہے، بلکہ مرزا نوشہ کا شاگرد تخلص میکش [23] ہے۔ جو شراب نہ پیوے اس کے نزدیک عیب ہے، مگر مدعی دائم الخمر ہے۔ اس واسطے اس کی نسبت کچھ تضحیک نہیں ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے۔ سیلی وگردنی ہارا برائے او بکار برند، یعنی ہنسیں ان کے اوپر اور اصل یہی ہے۔

ص 51 میں لکھا ہے کہ فِصد باید کشاد، یہ محاورہ روزمرہ کا ہے۔ کچھ سختی کلام نہیں ہے۔

ص 62 میں ہے۔ ''خبطی'' لغوی معنی اس کے یہ ہیں: لڑ چلنا۔

ص 66 میں لکھا ہے: ''از خرابۂ اکبرآباد بُوے بہ دہلی رسیدہ است۔'' یہ صنعت، صنعتِ ایہام ہے، مگر اس جگہ معنی زمین کے بھی اچھی طرح ہو سکتے ہیں۔

ص 70 میں لکھا ہے 'لفظ ازیں عضو' اس ازیں عضو کی ضمیر بہ طرف قریب پھرتی ہے۔ عضو تناسل کی طرف مگر کوئی ؟ (قرینہ) کافی نہیں ہے۔

ص 127 میں جو لکھا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خوب اس کو سزا دینا۔

ص 141 میں لکھا ہے لفظ ''ازار'' اس کے معنی عربی میں چادر کے ہیں۔ مگر ہندی میں

پائجامہ کو کہتے ہیں۔ بہ کتاب فارسی اگر یہ لفظ دیکھا جائے تو بہ معنی چادر سمجھا جاوے گا۔

ص 142 میں لفظ ''خایہ'' کا لکھا ہے۔ یہ بھی صنعت ایہام ہے، مگر اس مقام پر معنی بیضۂ مرغ کے ہیں۔

ص 164 میں جو لکھا ہے، اس کے معنی یہ ہیں (؟) اور ایسے مقام پر یہ عبارت لکھی جاتی ہے کہ جو حرکت بیجا ظہور میں آئی ہو جیسا کہ رقص بتلا۔

ص 172 میں جو عبارت لکھی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حاکم خوب سزا دے گا۔

ص 38، عبارت متنازع کو تو ہم لطافت اور خوبی بیان کرتے ہیں اور ایسی تحریر میں دشنام یا ہتک نہیں سمجھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مولوی ضیاء الدین نے یہ بیان مدعا علیہ کے وکیل کے مشورے اور ہدایت پر دیا ہوگا۔ دوسرے گواہوں نے بھی انہیں کی تائید کی ہے۔ مقدمہ سننے والا انگریز، اسے کیا معلوم کہ جو کچھ یہ مولوی صاحبان کہہ رہے ہیں، کہاں تک صحیح اور درست ہے۔ اور کس حد تک حیلہ اور فریب۔ لیکن غالب فوراً سمجھ گئے کہ وہ ان شہادتوں کی موجودگی میں اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ ادھر شہر کے بعض عمائد فریقین سے کہہ ہی رہے تھے کہ وہ یہ مقدمہ ختم کریں اور صلح صفائی کر لیں۔ اب جب مقدمے میں کامیابی کی توقع نہ رہی، تو انہوں نے ان حضرات کے بیچ بچاؤ کو غنیمت جانا اور مقدمہ واپس لے لیا۔ چنانچہ ان کے وکیل منشی عزیز الدین نے عدالت میں یہ درخواست پیش کر دی۔

جناب عالی

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ، بنام مولوی امین الدین بابت ازالہ حیثیت عرفی حسب منشائے دفعہ 499 تعزیرات ہند بہ عدالت ہے۔ چنانچہ بہ فہمائی چند گرامی روسائے شہر باہم رضامندی ہوئی۔ اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدمہ باقی نہیں، مقدمہ داخل دفتر ہو جائے۔

عرضی

عزیز الدین وکیل مدعی 23/مارچ 1868ء

اس پر حکم ہوا:

از پیش گاہ اوبریں صاحب بہادر

مقدمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر[24]

فقط

مولوی امین الدین کے تمام گواہوں سے مرزا غالب کا بھی ملنا جلنا تھا، لیکن انھوں نے ملزم کو بچانے کی خاطر قابل اعتراض فقروں کے ایسے معنی کیے جن سے اس پر کوئی الزام عائد نہ ہو اور اس طرح تلبیس سے کام لیا، حالانکہ عبارتیں بھی صاف تھیں اور سیاق و سباق سے ملزم کا مدعا بھی بالکل واضح اور عیاں تھا۔ جب مقدمہ ختم ہوگیا تو کسی نے مرزا غالب سے پوچھا: حضرت انہوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ اس پر مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

بہر چہ درنگری جز بجنس مائل نیست

عیارِ بیکسی من شرافتِ نسبی است

یعنی میری بیکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے، کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ چونکہ شرافت نسبی میں میرا کوئی ہم جنس نہیں اس لیے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا[25]۔

لیکن ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے میں کامیابی اور ناکامی تو ثانوی بات تھی۔ اصلی مسئلہ یہ تھا کہ کیا مرزا نے جو کچھ قاطع برہان میں لکھا تھا اور برہان قاطع پر جو اعتراض کیے تھے، وہ حق پر مبنی تھے یا نہیں، تو یہ بعد کی شہادتوں سے ثابت ہوگیا کہ ان کے بیشتر اعتراض درست تھے۔ بے شک بعض مقامات پر ان سے بھی تسامح ہوا اور انھوں نے بعد کو ان سے رجوع بھی کرلیا۔ لیکن جیسا کہ حالی نے لکھا ہے[26] فرہنگ ناصری (مرتبہ رضا قلی خاں ہدایت) نے جو مرزا کی وفات کے بعد ایران میں چھپی، جا بجا ان کی تائید کی ہے۔ ابھی چند سال ہوئے برہان قاطع کا ایک ایڈیشن تہران سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مرتب محمد معین نے بھی بہت جگہ پر مرزا کی تائید کی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ قاطع برہان کا بنیادی مواد محض مرزا کی یادداشت پر مبنی تھا، جب نہ کوئی کتاب ان کے پاس تھی، نہ لغت ہی کا کوئی مجموعہ، تو اس سے ان کی فارسی زبان سے فطری مناسبت کا جو ثبوت ملتا ہے، وہ ناقابل تردید ہے۔

5۔نواب کلب علی خاں سے چپقلش

مرزا صاحب والیِ رامپور نواب یوسف علی خاں کے استاد تھے۔نواب صاحب موصوف کا تخلص ناظم تھا اور یہ بھی غالب کا تجویز کردہ تھا۔ جب تک ناظم زندہ رہے، مرزا صاحب کی ان سے گاڑھی چھنی۔نواب صاحب نے ان کا ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا تھا جو انھیں باقاعدہ ہر مہینے ملتا رہا۔اس کے علاوہ بھی وہ سلوک کرتے رہتے۔عندالضرورت غالب بھی مطالبہ کرنے سے گریز نہ کرتے۔نواب صاحب نے ہمیشہ ان کی مدد کی۔غرض دونوں کے بہت یگانگت کے تعلقات تھے۔

نواب یوسف علی خاں فردوس مکان کا اپریل 1865ء میں بعارضۂ سرطان انتقال ہوگیا۔ان کی جگہ ان کے فرزند اکبر نواب کلب علی خان وسادہ آرائے مسند رامپور ہوئے۔نواب کلب علی خاں بہت تعلیم یافتہ اور فاضل آدمی تھے۔اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔اردو میں منشی امیر مینائی سے تلمذ تھا اور فارسی میں مرزا محمد تقی خاں سپہر مؤلف ناسخ التواریخ سے۔

جب نواب فردوس مکان کا انتقال ہوا تو قدرتاً غالب کے دل میں اندیشہ گزرا کہ اب مجھے والیِ عہد سے استادی کا تعلق تو رہا نہیں، خدا معلوم، میری سو روپے ماہانہ کی تنخواہ جاری رہتی ہے یا نہیں! بارے جب انھوں نے نواب فردوس مکان کی تعزیت کا خط لکھا، تو نواب کلب علی خاں نے اس کے جواب میں انھیں یہ اطلاع دی کہ جو مشاہرہ آپ کا حضرت نواب صاحب قبلہ کے عہد سے مقرر ہے، وہ انشاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری رہے گا۔اس پر غالب نے اطمینان کی سانس لی۔

اگست 1866ء میں نواب کلب علی خاں نے اپنے دیرینہ مصاحب اور دوست مولوی محمد عثمان خاں بہادر مدار المہام ریاست کی شرح قصائد بدر چاچ پر تقریظ لکھی۔چونکہ یہ تحریر فارسی میں تھی، انھوں نے اسے بغرض اصلاح غالب کے پاس بھیج دیا۔

غالب کا ہندوستانی فارسی نویسوں کے بارے میں جو رویہ تھا، اور وہ ان کی فارسی کو جس نظر سے دیکھتے تھے، اس سے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔انھوں نے نواب صاحب کی فارسی عبارت میں ایسی اصلاحیں دیں، جو بیشتر ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کے کلام نظم ونثر میں ملتی

ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے ''رشک ارژنگ مانی'' لکھا تھا۔ مرزا صاحب نے ارژنگ کی جگہ ارتنگ بنا دیا۔ ایک اور جگہ محاورہ آشیاں چیدن استعمال ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ یہ غلط ہے، اس کی جگہ آشیاں بستن یا آشیاں ساختن چاہیے۔ جب یہ تحریر نواب صاحب موصوف کے پاس واپس پہنچی تو انھوں نے مرزا کو لکھا[27] کہ:

''نیستاں خامہ کو در تحریر معانیِ شعر عرفی وہم تحقیق لفظ ارتنگ وارژنگ گوہر بار گردیدہ، بر خاطر اخلاص مردش ہر آئینہ مخفی ومحجب مباد کہ اکثر مالک رقابان علم لغت ارتنگ وارژنگ را بمعنی واحد پنداشتہ اند، وعامۂ مفسران کلام شیرازی مشار، ''آشیاں چیدن'' را مرادف آشیاں بستن نگاشتہ، چنانچہ نظیر ہر یکے ملفوف عنبریں نامہ ہذا ست، بمطالعہ خواہد رسید، مع ہذا اگر طبع آں استاد زماں بہ ترقیم الفاظِ بالا فی الجملہ نفوری داشتہ ہمچناں حوالہ قلم نمائید کہ مجوث عنہ را از تقریظ اصلاح شدہ چو نفسانیت خود محو سازم زیرا کہ مرا ازاں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است، نہ از عرفی ودیگراں، اما نظیرے بنظر گزشتہ است، صرف برائے اطلاع بہ نمیقۂ ہذا مندرج گردید۔''

نواب صاحب نے یہ خط بہت تحمل اور ضبط سے لکھا ہے۔ لیکن اس میں جو انھوں نے لکھا کہ ''مرا ازاں مشفق واسطہ تلمذ بودہ است'' چونکہ یہ بات خلاف واقع تھی، اس سے مرزا کو دھوکا ہوا۔ اور انھوں نے حسب عادت ہندوستانی فارسی دانوں کے ناقابل اعتماد ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا[28]:

اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا۔ مرا ازاں مشفق واسطہ تلمذ بودہ است، یہ ذلیل کو عزت دینی اور دکان بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

''بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا...... بارے...... اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا...... اور میں نے اس سے حقائق ودقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امر خاص میں

نفسِ مطمئنہ حاصل ہے۔ دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریق یاد نہیں......۔''

''فقیر اشعار قدما کا معتقد ان لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں، ان کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں کیونکر ان کے قیاس پر تکیہ کروں، اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ ارتنگ وارژنگ متحد المعنی اور آشیاں ساختن وبستن وچیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا، لیکن نہ ان صاحبوں کے قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق۔''

غالب کا یہ خط انگریزی کہاوت کے مطابق وہ آخری تنکا ثابت ہوا، جس سے اونٹ کی کمر دوہری ہو کر ٹوٹ گئی۔ پہلے تو نواب صاحب نے ''میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں'' کو تعریض پر محمول کیا، حال آنکہ اس سے غالب بیچارے کو صرف چاپلوسی اور خوشامد مقصود تھی۔ مرزا نے لکھا تھا، ''بحث کا طریق یاد نہیں۔'' نواب صاحب نے خیال کیا کہ مرزا مجھ سے بات چیت کرنا اور افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرنے سے انکار کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں بے چون وچراں اُن کی بات مان لوں، وہ مری دلیل سننے پر تیار نہیں۔ اس کے بالعکس مرزا کا مفہوم صرف اتنا تھا کہ میں اپنے فارسی علم پر مطمئن اور قانع ہوں اور ہندوستان کے فارسی نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے سروکار نہیں ہے۔ واقعی اگر غالب کا وہی مقصود ہوتا، جیسا نواب صاحب نے خیال کیا، تو یہ نامناسب ہی نہیں، سخت گستاخی کی بات ہوتی۔ اس پر نواب صاحب نے غالب کو جو جواب لکھا اگر چہ وہ بردباری اور ضبط کا نادر نمونہ ہے، بالخصوص اس لیے کہ لکھنے والا ایک ریاست کا مطلق العنان حکمراں ہے، لیکن اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ راقم کے دل میں کتنا رنج اور غصہ ہے۔ پورا خط ملاحظہ ہو۔[29]

''مکتوبِ حیرت اسلوبِ مشعرِ اختراعِ معنی غلط نسبت ہندی نژادان پیشین ودیگر اعتراضہا وایں کہ راقم را طریقہ بحث یاد نیست، موصولِ مطالعہ گشتہ باعث استعجابِ عظیم گردید از آں جا کہ تا حال ورائے تحقیق وتنقیح امور علمیہ کہ معاذ اللہ، از مناظرہ ومناقشہ چشم حق بیں بسا بعید می نماید، امرے دیگر بظہور نیامدہ

وآں چہ حالِ خاطرم بودے (بے) ریب ورنج حوالہ قلم دقائق سنج گردیدہ۔ ولیکن نازم بردذ ہن موشگاف آں فرید زماں کہ نوشتہ ام رابر بحث واجتہاد محمول نمودہ۔ امثالِ ایں کنایہ ہائے نو، مثلِ نسبت استادی بجانب راقم ولفظ بحث کہ ہر دو خلاف واقع وموروثِ رنج وعنا است، نگاشتند۔ پس اگر آں مشفق راہمچنیں منظور باشد، اشارتے سازند کہ واسطۂ ترسیل رسائل از فی مابین برداشتہ شود، ورنہ بُنانِ خامہ را باموردِ خارج المجث تکلیف ندادہ باشند کہ نتیجہ اش سوائے صداع الرّاس امرے بخیال نمی رسد، وراقم پایۂ اعتبار محققاں کہ صاحب تصانیف مقبولۂ انام بودہ اند، از خود زیادہ دانستہ، بحوالہ کلام شاں پرداختہ، اگر نزد آں صمیمِ جاویدہ آنہا قابل قبول نبود، بایستے کہ ہم برآں نمط تحریری ساختند مصلحت ایں قدر اطنابِ سخن از فہم ہیچمدانی بیروں۔ زیادہ ازیں نوشتن حکمت بلقمان آموختن است۔"

جب غالب کو یہ عتاب نامہ ملا تو ان کے دل ودماغ کی جو کیفیت ہوئی ہوگی، وہ تصور کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے حلفاً لکھا[30] کہ:

"انکار بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرائے ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو ان کی عقول میں اختلاف ہیں، ان میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اوروں سے مجھے بحث نہیں۔"

اس پر نواب صاحب نے لکھا[31]:

"سابق ازیں بملاحظہ مضمون مفاوضہ سابقہ امرے کہ متخیل شدہ بود، بے شائبۂ تکلف حوالہ خامۂ گردید حالانکہ آں مہربان بتاویلش پرداختند ازاں دفع شکوک کماحقہٗ گردید۔ خاطر لطف مشاعر مقرونِ جمعیت باشد۔"

لیکن اس کے بعد انھوں نے نہ کبھی کوئی تحریر بغرض اصلاح غالب کے پاس بھیجی، نہ کوئی ادبی سوال ہی ان سے کیا۔ گویا وہ زبانِ حال سے اپنی ناراضگی اور خفگی کا اظہار کرتے رہے[32]۔

یہ ہے مختصر داستان غالب کے ادبی معرکوں کی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان تمام کی بنیاد ان کے اس مفروضے پر ہے کہ ہندوستان کے فارسی گو اور لغت نگار غلط نویس اور غیر مستند ہیں۔ اگر فارسی کلام کی صحت وراستی معرض بحث میں ہے، توان کی سند پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس کے لیے ہمیں لازماً اہل زبان کے کلام سے سند اور شہادت تلاش کرنا پڑے گی۔

(نقوش، ادبی معرکے نمبر)

حواشی

1. یادگار غالب (حالی) (مرتبہ مالک رام: 121 (مکتبہ جامعہ، دہلی، 1971ء۔
2. ذکرِ غالب (مالک رام): 34 (حاشیہ 1) (مکتبہ جامعہ، دہلی، 1976ء)۔
3. خطوط غالب (مہر) 2:285 (خط بنام عبدالرزاق شاکر)
4. یادگارِ غالب: 123۔
5. ایضاً: حاشیہ۔
6. محمد حسین آزاد نے یہ قطعہ یوں لکھا ہے:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے	مزا کہنے کا جب ہے، ایک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے، اور زبانِ میرزا سمجھے	مگر ان کا کہا، یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

(آبِ حیات: 610)

میں نے جس طرح سے اوپر درج کیا ہے، یہ اُس قلمی دیوان پر مبنی ہے، جو انڈیا آفس لائبریری، لندن میں محفوظ ہے (ص وو (الف)) خدا معلوم، عیش ہی نے بعد کو اسے اس طرح تبدیل کر دیا، جیسے آزاد نے درج کیا ہے، یا آزاد نے خود عیش کے کلام پر اصلاح دی ہے۔

7. یادگارِ غالب: 126۔
8. ایضاً

9۔ ذکرِ غالب:63

10۔ خطوطِ غالب (غلام رسول مہر)2:291 (طبع اول، کتاب منزل، لاہور)

11۔ قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ (مرتبہ قاضی عبدالودود):155 (دہلی، 1967ء)

12۔ کلیات فارسی نثر (غالب:80 (بنام محمد علی خان) خطوط غالب، 2:291، ایضاً، 2:155۔

13۔ مآثر غالب:27

14۔ غالب:121، نیز نقشِ آزاد:279

15۔ ہفت آسمان:1 (دیباچہ)

16۔ کلیات نثر فارسی (غالب):80

17۔ یہاں متن اس نسخے کے مطابق درج ہے جو ''گل رعنا'' (غالب) مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی (لاہور، دسمبر 1969ء) میں شامل ہے۔ میرے نزدیک یہ اس مثنوی کی اولیں روایت ہے۔ بعد کو انھوں نے بعض اشعار کے حذف و اضافہ اور الفاظ کے ردوبدل سے اسے اس طرح کر دیا جیسے یہ اب متداول کلیات میں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل کلکتہ کے سامنے یہ اس شکل میں پیش کی گئی ہوگی، جیسے ''گلِ رعنا'' میں چھپی ہے۔

18۔ داستانِ غدر:99-100

19۔ یادگارِ غالب:55

20۔ اگر چہ ''لطائف غیبی'' پر میاں داد خان سیاح کا اور ''سوالات عبدالکریم'' پر عبدالکریم کے نام چھپے ملتے ہیں، لیکن تمام قرائن اس پر دال ہیں کہ یہ دونوں رسالے خود غالبؔ نے لکھے اور دوستوں کے نام سے شائع کر دیے (دیکھیے ذکرِ غالبؔ:184-187 نیز آجکل فروری 1953ء)۔

21۔ جواہر سنگھ جوہر، غالب کے ایک شاگرد کا بھی نام ہے، لیکن وہ دہلوی تھے۔ یہ دوسرے صاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

22۔ ولیم فیروز مارچ 1835ء (مطابق ذی قعدہ 1250ھ) میں قتل ہوا تھا۔ اس مصرعے سے یہ تاریخ برآمد نہیں ہوتی۔

23 میر احمد حسین میکش

24 اس مقدمے کی پوری کارروائی پہلے سہ ماہی رسالۂ اُردو کے شمارۂ اپریل 1943ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہیں سے مرتبِ ''احوال غالب'' پروفیسر مختار الدین احمد نے اسے اپنے ہاں لے لیا(ص139-171) اگرچہ اصلی فائل میں بھی کئی مقامات پر عبارت مغشوش ہے، لیکن ان دونوں جگہوں میں اصل متن سے بھی انحراف ہے کہیں کہیں عبارت چھوٹ گئی ہے۔ بعض لفظ ٹھیک نہ پڑھنے کے باعث غلط لکھے گئے ہیں۔ یہاں جس طرح لکھا گیا ہے، یہ اصلی فائل پر مبنی ہے۔

25 یادگارِ غالب:62

26 ایضاً:56-57

27 مکاتیبِ غالب:174 (حواشی) (مرتبہ عرشی:1947ء)

28 مکاتیبِ غالب:60-61 (متن)

29 مکاتیبِ غالب:175 (حواشی)

30 ایضاً:61 (متن)

31 ایضاً:176 (حواشی)

32 نیز اس سلسلے میں دیکھیے مضمون:''دربارِ رامپور سے تعلقات''مشمولۂ فسانۂ غالب (مالک رام) دلّی 1977ء۔

سید قدرت نقوی

غالب کا ایک نایاب خط

کافی دن بیتے کہ میں کچھ مخطوطات دیکھنے قومی عجائب گھر کراچی جایا کرتا تھا۔ ایک روز ناظم کتب خانہ نے غالب کا ایک خط دکھایا جو عجائب گھر میں فروخت کے لیے آیا تھا۔ ناظم کتب خانہ نے تصدیق چاہی کہ یہ غالب ہی کا خط ہے اور کیا تحریر بھی غالب ہی کی ہے۔ میں نے دیکھا پڑھا اور تصدیق کردی کہ واقعی غالب ہی کا خط ہے اور انھیں کی تحریر ہے۔ غالب کے قلم کی بہت سی تحریریں، تحریروں کے عکس میری نظر سے گزر چکے تھے، مجھے یہ خط اور اس کا رسم الخط غالب کا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوا۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر خلیق انجم بھارت سے آئے، وہ غالب کے خطوط پر کافی دن سے کام کررہے ہیں۔ غالب کے خطوط تین جلدوں میں چھاپ چکے ہیں اور چوتھی جلد چھپنے کی تیاری ہورہی ہے۔ ان سے میں نے اس خط کا ذکر کیا اور وعدہ کیا کہ میں کاغذات میں تلاش کروں گا اور اس کی نقل بھیج دوں گا۔

میں نے خط اب تک اس لیے پیش نہیں کیا تھا کہ اس کے مکتوب الیہ کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔ جن صاحب نے یہ پیش کیا تھا ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کے کسی بزرگ کے نام ہے۔ مگر مجھے یہ بات درست معلوم نہیں ہوئی۔ کیوں کہ خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ مکتوب الیہ اور اس کے لواحقین و متعلقین سے غالب کے کافی گہرے مراسم تھے۔ اور یہ کہ یہ پہلا خط نہیں ہے، بلکہ خط و کتابت کا سلسلہ دیرینہ ہے۔ اس کا ثبوت احسان حسین خاں کی بیماری اور نوروز علی خاں کی وفات کے ذکر سے ملتا ہے۔ شیخ ولی اللہ دہلوی کی کتاب تفہیمات شیخ ولی اللہ، کے متعلق غالب نے معلومات فراہم

کی ہیں۔ اس بیان سے بھی یہ مترشح ہے کہ مکتوب الیہ سے غالب کی خط و کتابت ہوتی رہی ہے، اس لیے اور بھی خطوط ہونے چاہییں۔ غالباً یہ خط کہیں سے ہاتھ لگ گیا جسے اپنے بزرگ کے نام کا بتا دیا۔

مکتوب الیہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، وہ کسی کام سے کلکتہ جا رہے تھے۔ ابھی کانپور ہی میں تھے کہ احسان حسین کی علالت کی وجہ سے کانپور ہی سے لکھنؤ کے لیے مراجعت کرنی پڑی۔ غالب نے لکھنؤ سے کلکتہ اور دہلی سے لکھنؤ جانے کے راستے کی تفصیل بیان کی ہے۔

مکتوب الیہ کے علاوہ احسان حسین خاں اور نوروز علی خان کی شخصیتیں بھی تحقیق طلب ہیں۔ اب جب کہ مجھے ان شخصیتوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا تو مناسب یہی سمجھا کہ اس خط کو شائع کر دیا جائے۔ شاید کوئی ان ہستیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے۔

غالب اعراب بالحروف استعمال کیا کرتے تھے۔ بالخصوص الف مضموم کے ساتھ واو...... اظہار ضمہ کے طور پر لکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے ان الفاظ میں ''وٗ'' کے ساتھ املا کی ہے۔

اون، اُن: اوس، اُس، اودھر، اُدھر ہم نے اس املا کو برقرار رکھا ہے۔

قدما اور متوسطین کی یہ روش تھی کہ جب 'مجھ' کا الحاق 'کو' کے ساتھ کرتے تو اسے ملا کر لکھتے اور ''جھ'' کی جگہ 'ج' لاکر ''مجکو'' املا کرتے۔ غالب نے اسی قدیم روش کے مطابق م''جکو'' لکھا ہے۔ ہم نے بھی یہی املا برقرار رکھا ہے۔

موجودہ دور سے پہلے یائے معروف ویائے مجہول میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ غالب نے اس خط میں چھ جگہ یائے معروف کے بجائے یائے مجہول استعمال کی ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں:

کوے، کوئی۔ اتنے، اتنی۔ کے، کی۔ آئے، آئی۔ قلمے، قلمی۔ کوے، کوئی۔

غالب عبارت میں بارہ کا ہندسہ لکھ کر ایک مطلب ختم ہونے کی نشاندہی کرنے کے عادی تھے۔ یہ بارہ کا ہندسہ 'حد' کے اعداد ہیں۔ اس خط میں جہاں غالب نے 12 کا عدد لکھا ہے، ہم نے بھی وہ برقرار رکھا ہے۔ اس طرح ایک پیراگراف ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا نیا پیرا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی حساب سے ہم نے بھی پیراگراف قرار دیے ہیں۔

علامات رموز اوقاف ہم نے دور جدید کے مطابق استعمال کی ہیں۔ان سے غالب کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔آج کل ان کا استعمال ناگزیر ہے۔

میرے نزدیک حروف علت الف، واؤ، اور یا کے بعد جب یائے اضافت وتوصیف آتی ہے تو اس پر ہمزہ لگانا ضروری ہے۔مگر غالب اس کے قائل نہ تھے۔لہٰذا ہم نے اس خط کے متن میں غالب کی روش کو برقرار رکھا ہے۔

ان وضاحتوں کے بعد اب غالب کا خط ملاحظہ فرمایئے:

خاں صاحب!

جمیل المناقب عمیم الاحسان، سعادت و اقبال توامان سلمہ اللہ تعالیٰ!

بعد ادائے ہدیۂ سلام مسنون، و دعائے ترقی دولت روز افزوں، غالب خونیں جگر کہتا ہے۔اللہ اللہ! میرے آقائے نامدار صاحبِ دلدل و ذو الفقار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول حق ہے۔

"عرفت ربّی بفسخ العزائم"

آپ کا قصد تھا کہ کانپور سے الہ آباد اور وہاں سے کلکتے جائیں، سو یہ واقع ہوا کہ کانپور سے آپ پھر لکھنؤ آئیں۔12

واللہ! احسان حسین خاں بہادر کا حال سن کر بیتاب ہوگیا۔اتنی طاقت کہاں؟ کہ یہاں سے علی گڑھ تک ڈاک اور وہاں سے آگرہ تک اور کانپور تک ریل اور پھر کانپور سے لکھنؤ تک ڈاک میں پہنچوں اور اون کو دیکھوں۔ناچار دعا پر مدار ہے۔خالصاً للہ جلد جناب کی صحت کی نوید بھیجو۔12

یہ نہ جاننا کہ غالب نے اس خدمت محقر میں قصور کیا۔کتاب فروشوں کو کہہ رکھا ہے۔مولویوں سے سوال کر چکا۔تفہیمات شیخ ولی اللہ کا کہیں پتا نہ لگا۔یہ کتاب معرض الطباع میں نہیں آئی۔قلمی کہیں موجود نہیں۔12

ہائے ہائے! میرا دوست نوروز علی خاں خدا بخشے اوس کو۔کیسا لطیف

اورخلیق اوردانا آدمی تھا۔ میں کیوں افسوس کروں؟ کیا مجکو ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔بموجب قول شیخ علی حزیں۔ ؎

مستِ گزارہ ایم چوں موجِ از قفائے ہم　　　در کاروان ماقدمے نیست استوار

آگے پیچھے سب اودھر کو چلے جاتے ہیں،کوئی دودن آگے گیا کوئی دودن پیچھے چل نکلا۔

نجات کاطالب

غالب12

14رفروری1864ء

مطبوعات غالب اکیڈمی

	نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
1	دیوانِ غالب (ہندی)	غالب اکیڈمی	75/-
2	دیوان غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	60/-
3	غالب شناس مالک رام	گیان چند جین	90/-
4	شرح دیوان غالب	ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد علیگ	250/-
5	تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
6	فیضان غالب	عرش ملسیانی	22/-
7	غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
8	تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
9	انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
10	مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
11	ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
12	نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
13	اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
14	جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
15	رقص شرر	انّ میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
16	اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمٰن فاروقی	150/-
17	تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
18	جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
19	غالب کی سوانح عمری	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	250/-
20	دیوان غالب ڈیلکس (تین رنگوں میں)	غالب اکیڈمی	150/-